اُردو

دسویں جماعت کی درسی کتاب

مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش

پریاگ راج

Rs. 17.00

راجیو پراکشن - پریاگ راج

Royalty Paid Book

تشکیل کمیٹی برائے نصابی کتب

زیرسرپرستی:

جناب **دیپک کمار**، اپر چیف سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشنل، حکومت اتر پردیش۔

زیرِ نگرانی:

ڈاکٹر **مہیندر دیو**، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن (سکنڈری)، اترّ پردیش، لکھنؤ۔

کنوینر:

جناب **دِبیہ کانت شکلا**، سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اترّ پردیش، پریاگ راج۔

کوکنوینر:

جناب **اشوک کمار گپتا**، ایڈیشنل سکریٹری، (پا. پو. را)، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اترّ پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **شردھا شکلا**، ڈپٹی سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اترّ پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **منیشا کشواہا**، اسسٹنٹ سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن بورڈ، اتر پردیش، پریاگ راج۔

مجلس مشاورت:

1۔ ڈاکٹر **ظفر اللہ انصاری** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، اتر پردیش۔

2۔ ڈاکٹر **محمد کاشف** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، اتر پردیش۔

3۔ ڈاکٹر **فاضل احسن ہاشمی** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، اتر پردیش۔

4۔ ڈاکٹر **نفیس احمد** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، سی. ایم. پی. ڈگری کالج، پریاگ راج، اتر پردیش۔

5۔ ڈاکٹر **جگد مبا دوبے** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، حلیم مسلم پی. جی. کالج، کانپور، اتر پردیش

6۔ ڈاکٹر **شبنم رضوی** (ایسوسیئٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، کرامت حسین مسلم گرلس پی جی کالج لکھنؤ، اتر پردیش۔

7۔ ڈاکٹر **طاہرہ پروین** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، ایس. ایس. کھنّا ڈگری کالج، پریاگ راج، اتر پردیش۔

مجلس تصنیف وتالیف:

1۔ جناب **ابوبکر خاں** (لکچرار) سی۔اے۔وی۔انٹر کالج، پریاگ راج۔

2۔ جناب **محمد ارشد** (لکچرار) جی۔آئی۔سی۔، پریاگ راج۔

3۔ جناب **عبدالحکیم** (لکچرار) مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج، پریاگ راج۔

4۔ ڈاکٹر **اجے مالوی** (لکچرار) اینگلو بنگالی انٹر کالج، پریاگ راج۔

5۔ محترمہ **خولہ ناز** (لکچرار) حمیدیہ گرلس انٹر کالج، پریاگ راج۔

6۔ جناب **احسان احمد** (لکچرار) سینٹ اینڈ روج، انٹر کالج، گورکھپور۔

7۔ ڈاکٹر **شامہ عابدی** (لکچرار) کراسٹھویٹ انٹر کالج، پریاگ راج۔

8۔ محترمہ **شائستہ انجم** (لکچرار) راجکیہ ابھینو ودیالیہ، داندوپور، چاکا، پریاگ راج۔

9۔ ڈاکٹر **عصمت نیلو انصاری** (لکچرار) جی۔جی۔آئی۔سی۔پرتاپ گڑھ۔

10۔ محترمہ **ثنا صدیقی** (لکچرار) پتراچار شکشا سنستھان، پریاگ راج۔

11۔ ڈاکٹر **عبدالحی** (لکچرار) ضلع شکشا و پراشکشن سنستھان، پریاگ راج۔

12۔ محترمہ **شائستہ اقبال** (لکچرار) ضلع شکشا و پراشکشن سنستھان،، فتح پور۔

13۔ ڈاکٹر **شکیل فاطمہ** (اسسٹنٹ ٹیچرر) حمیدیہ گرلس انٹر کالج، پریاگ راج۔

14۔ محترمہ **شبانہ انجم** (اسسٹنٹ ٹیچرر) جی.آئی.سی.، پریاگ راج۔

کوآرڈینیٹر:

محترمہ **بندو یادو،** لٹریری اسسٹنٹ، مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **سنگیتا یادو،** لٹریری اسسٹنٹ، مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش، پریاگ راج۔

پورٹریٹ:

آشیس نرائن

پیش لفظ

اردو ہمارے ہندوستان کی ان زندہ زبانوں میں سے ہے جس کا دائرہ نہایت ہی وسیع ہے۔ اردو کے بولنے والے سارے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا ادبی سرمایہ بھی وقیع و وسیع ہے۔ اس نے ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ریاستِ اتر پردیش کو ابتدا ہی سے اس زبان کا گہوارہ ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہاں کے ادبا اور شعرا نے اس زبان کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کر کے اس کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ عوامی سطح پر بھی یہ زبان کافی مقبول رہی ہے اور اس کی مقبولیت کا خیال رکھتے ہوئے اس کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اس کی ترویج و اشاعت اور عروج و ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ کسی بھی ملک کی ترقی اس کے تعلیمی و تدریسی معیار پر منحصر ہوتی ہے۔ جس ملک کا تعلیمی معیار جتنا بلند اور برتر ہوگا وہ ملک اتنا ہی ترقی یافتہ ہوگا لہٰذا تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے حکومتیں ہمیشہ کوشاں رہی ہیں ''جدید نظریۂ تعلیم **2020**'' میں مختلف مضامین کے ساتھ ساتھ زبان کو وقیع و وسیع بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے **2022**ء میں اتر پردیش حکومت کی جانب سے ایک نصابی کمیٹی عمل میں آئی جس نے جدید تعلیمی تقاضوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے نصاب پر غور و فکر کرتے ہوئے اپنی تجاویز پیش کیں جن میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا کہ این.سی.ای.آر.ٹی. کے نصاب اپنائے جانے کی وجہ سے مقامی شعرا و ادبا کی تخلیقات نصاب سے خارج ہو جائیں گی۔ اس لیے ایس.سی.ای.آر.ٹی. نے یہ فیصلہ کیا کہ ماہرین زبان و ادب اور اساتذہ کی ایک کمیٹی کے

ذریعے این.سی.ای.آر.ٹی.کے طرز پر کتابیں شائع کرائی جائیں۔ان کتابوں کے تیار کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھاّ جائے کہ مذکورہ کتابوں کے مشمولات طلبہ اور طالبات کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوں اور ان کتابوں کی مدد سے وہ صحیح اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھ سکیں،اس کے علاوہ اُن کے اندر زبان کی محبت اور ادب کا ذوق بھی پروان چڑھ سکے۔ان کتابوں سے ہمارے طلبہ وطالبات میں فکروشعور،تنقیدی نقطۂ نظر اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان میں انسانی قدروں کے تئیں احترام کا جذبہ بھی پیدا ہو۔

مذکورہ مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کئی مرحلوں میں اردو ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مرکزی وریاستی سطح کے مختلف اداروں سے متعلق اساتذہ شریک ہوئے اور کتابوں کی ازسرِنوتحریروتالیف، ترتیب، تدوین اور نظرِ ثانی کا عمل سرانجام دیا۔ان کتابوں میں نصاب اور امتحان کے طریقوں کے سبھی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مشقی سوالات میں تنوع رکھا گیا ہے اور اسباق دلچسپ بنانے کی غرض سے شعرا اور ادبا کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔اس ورکشاپ میں بورڈ کے تمام اراکین نے بڑی محنت،لگن اور پوری دلچسپی سے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا جس کے لیے وہ قابلِ تعریف وتحسین ہیں۔اتر پردیش مادھیمک شکشا پریشد ان تمام ارکان وشرکا کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے ان کتابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مہیندر دیو

ڈائریکٹر (مادھیمک)/چیئرمین

مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش

پریاگ راج

فہرست

نمبر شمار	شاعر/مصنف	مشمولات	صفحہ نمبر

(حصہ نثر)

		ناول	13
1	مرزا محمد ہادی رسؔوا	امراؤ جان ادؔا (انتخاب)	15
		انشائیہ	32
2	پطرس بخاری	سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی	33
3	رشید احمد صدیقی	چار پائی	50
		افسانہ	60
4	کرشن چندر	پورے چاند کی رات	62
5	راجندر سنگھ بیدی	گرم کوٹ	83

	خاکہ		105
6	مولوی عبدالحق	حالی	107
	مضمون		125
7	احتشام حسین	ہندوستانی تہذیب کے عناصر	126

حصہ شعر و نظم

	غزل		
8	حالیؔ	ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں	145
9	اقبالؔ	ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں	152
10	حسرتؔ	روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام	159
11	فانیؔ بدایونی	ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا	165
12	اصغرؔ گونڈوی	پاتا نہیں جو لذّتِ آہ سحر کو میں	171
13	جگرؔ مرادآبادی	جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے	177
14	فراقؔ گورکھپوری	آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا	183
15	فیض احمد فیضؔ	کب ٹھہرے گا دردِ اے دل کب رات بسر ہوگی	190

	نظم		
16	نظیر اکبر آبادی	روٹی نامہ	199
17	حالؔی	مناجاتِ بیوہ	209
18	درگا سہائے سرورؔ	گلزارِ وطن	216
19	چکبستؔ	کشمیر	224
20	اقبالؔ	رام	231
21	جوشؔ ملیح آبادی	ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام	237
22	اخترؔ الایمان	قبر	247
23	علی سردار جعفریؔ	مشرق و مغرب	253
	قصیدہ		
24	مرزا محمد رفیع سوداؔ	اب سامنے مرے جو کوئی پیر و جواں ہے	263
	مرثیہ		
25	میر ببر علی انیسؔ	تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسہ ہوں میں	274

	ضمیمہ		
26	صنعتیں	حسنِ تعلیل، مرعات النظیر ، تضاد، تلمیح، لف و نشر، تجنیس، تشبیہ، استعارہ	288
27	محاورات وضرب الامثال	جملوں میں استعمال	293
28	مضمون نگاری	عیدالفطر، وقت کی اہمیت، کھیل	299
29	غیر درسی اقتباس کا خلاصہ	اگر کامیابی کی منزل تک پہنچنا ہے۔	305

اردو نصاب

درجہ: دسویں جماعت مجموعی نمبرات:100

نوٹ: اس نصاب میں 70 نمبر کا تحریری امتحان ہوگا جس کے اوّل حصّے میں 20 نمبر کا کثیر الجواب پر مبنی سوالات ہوں گے اور دوسرے حصّے میں 50 نمبر کا مختصر ترین، مختصر اور تفصیلی سوالات ہوں گے جبکہ 30 نمبر کا اندرونی تجزیہ اسکولی سطح پر کیا جائے گا۔

حِصّہ (الف)

(1) قواعد اور اس کا استعمال:

قواعد کے صرف انھیں عناصر پر زور دیا جائے گا جو زبان کے عملی معلومات اور اس کی تحریرو آپسی گفتگو پر مشتمل ہو۔ قواعد کی تدریس ایک مضمون کی حیثیت سے ضروری نہیں ہے لیکن طالب علموں کو جماعت میں پڑھاتے وقت زبان میں قواعد کی اہمیت اور جملوں میں استعمال پر زیادہ زور دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ طالب علموں کو جملوں کی صحیح ترتیب اور دوسری رائج علاقائی زبان میں ترجمہ کرنے کی مشق کرانی چاہیے۔

(2) اصناف ادب

(i) ناول (ii) انشائیہ (iii) افسانہ (iv) خاکہ (v) غزل (vi) قصیدہ (vii) مرثیہ

(3) صنائع وبدائع

حسن تعلیل، مراعات النظیر ، تضاد، تلمیح، لف ونشر، تجنیس، تشبیہ اور استعارہ

(4) محاورات وضرب الامثال

(5) مضمون نگاری

(6) غیر درسی نثری اقتباس کا خلاصہ

حصّہ (ب)

(1) مندرجہ ذیل نثری اسباق متعین ہیں:

الف۔	(1) امراؤ جان ادا (اقتباس)	مرزا ہادی رسوؔا
	(2) سویرے جو کل آنکھ میری کھلی	پطرس بخاری
	(3) چارپائی (اقتباس)	رشید احمد صدیقی
	(4) پورے چاند کی رات	کرشن چندر
	(5) گرم کوٹ	راجندر سنگھ بیدی
	(6) الطاف حسین حالؔی	مولوی عبدالحق
	(7) ہندوستانی تہذیب کے عناصر	پروفیسر احتشام حسین

(ب) نصاب میں شامل ادیبوں کی سوانح حیات، نثر نگاری کی خصوصیات اور طرز نگارش کی معلومات فراہم کرانا۔

حصّہ نظم

غزلیات: حالؔی، اقبالؔ، حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، فانیؔ بدایونی، جگرؔ مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری، فیض احمد فیضؔ۔

نظمیات: نظیرؔ اکبرآبادی، حالؔی، درگا سہائے سرورؔ، چکبست، اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، اخترؔ الایمان، علی سردار جعفریؔ۔

قصیدہ: محمد رفیع سوداؔ۔

مرثیہ: میر انیسؔ۔

(2) اردو شعراء جو نصاب میں شامل ہیں ان کی سوانح حیات اور ان کے کلام کی خوبیوں سے طالبِ علم کو روشناس کرایا جائے۔

(3) اردو زبان وادب کا ارتقاء۔

ناول

ناول کے لفظی معنی ''نئے'' کے ہیں۔ یہ لفظ دراصل اطالوی لفظ **NOVELLA** سے نکلا اور انگریزی ادب کے زیر اثر اردو میں آیا۔ مغرب میں ناول کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ یہ ایک ایسا نثری قصّہ ہے جس میں صنعتی عہد کے پس منظر میں فرد اور سماج کی کشمکش دکھائی گئی ہو۔

اردو میں ناول سے مراد ایسے نثری قصّہ سے ہے جس میں ایک واضح اور منظّم پلاٹ ہو، جس میں خیالی کہانیوں کے بجائے زندگی کے مسائل و معاملات اور واقعات تسلسل کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ ناول کا فن انسانی معاشرے کی سرگرمیوں اور ان میں پیدا ہونے والی مختلف قسم کی کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول اپنے اندر تجربات اور زندگی کے حقائق کا شعور رکھتا ہے۔ فنی اعتبار سے ناول کی تشکیل کے لئے قصّہ یا پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور نقطۂ نظر کو بنیادی اجزائے ترکیبی قرار دیا گیا ہے۔ ان اجزائے ترکیبی میں پلاٹ اور کردار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، ان کے بغیر ایک معیاری ناول نہیں لکھا جا سکتا ہے۔

اردو میں **1857**ء کے بعد تہذیبی اور تمدّنی زندگی کے مختلف گوشوں میں قدیم و جدید، مشرق و مغرب عقلیت اور مذہب کی کشمکش شروع ہوگئی تھی۔ اس تصادم کی فضا نے ناول کے لئے سازگار ماحول فراہم کیا۔ اردو میں ناول کے باقاعدہ آغاز کا سہرا ڈپٹی نزیر احمد کے سر ہے۔ ان کے ناول ''مرآۃ العروس''، ''توبتہ النّصوح''، ''فسانۂ مبتلا''، اور ''ابن الوقت'' ناول کے اولین نمونے ہیں، مگر یہ ناول کے فنی تقاضوں پر کھرے نہیں اترتے ہیں۔ نذیر احمد کے بعد سرشار نے ناول کو نیا موڑ دیا۔ ''فسانۂ آزاد'' سرشار کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ سرشار کے بعد عبدالحلیم شرؔر کا نام آتا ہے، انھوں نے تاریخی ناول

لکھے۔ان کا ناول ''فردوس بریں'' قابل ذکر ہے،اس دور کے دیگر ناول نگاروں میں سجاد حسین، سرفراز حسین وغیرہ ناول نگاروں نے بھی ناول کی روایت کو آگے بڑھایا۔ناول نگاروں کی اگلی کڑی میں مرزاہادی رسؔوا خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے ناول ''امراؤ جان ادا''، ''شریف زادہ'' اور ''ذاتِ شریف'' ہیں جس میں ''امراؤ جان ادا'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔اسے اردو کا پہلا کامیاب ناول قرار دیا گیا ہے۔رسؔوا کے بعد منشی پریم چند نے اردو ناول کو عام انسانوں کی زندگی کا ترجمان بنایا۔ پریم چند کے ناول ''بازارِ حسن''، ''گوشۂ عافیت''، ''غبن''، ''میدانِ عمل'' اور ''گئودان'' میں گئودان کو لازوال مقبولیت حاصل ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری کی معراج ''گئودان'' میں ملتی ہے۔

پریم چند کے بعد کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' عصمت چغتائی کا ''ٹیڑھی لکیر'' سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات'' کرشن چندر کا ''شکست'' اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ان ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اردو ناول کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔اس کے علاوہ بھی عبداللہ حسین، حسین الحق، نورالحسنین، شموئل احمد، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی، حیات اللہ انصاری، انتظار حسین، جیلانی بانو، عبدالصمد، الیاس احمد گدّی، سید محمد اشرف، غضنفر، پیغام آفاقی اور مشرف عالم ذوقی نے بھی ناول نگاری کے سفر کو آگے بڑھایا۔

سبق (1) مرزا ہادی رسوؔا

مختصر سوانح

(1) نام : مرزا محمد ہادی

(2) تخلّص : رسوؔا

(3) ولادت : 1858ء لکھنؤ

(4) وفات : 21 اکتوبر 1931ء حیدرآباد

(5) مشہور تصانیف: شریف زادہ، ذاتِ شریف اور امراؤ جان ادا۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں مرزا ہادی رسوؔا کا نام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کا شاہکار ناول 'امراؤ جان ادا' اردو کا پہلا کامیاب اور مکمل ناول مانا جاتا ہے جو تنقید کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے اور تقریباً ایک صدی بیت جانے کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

مرزا رسوؔا کا پورا نام مرزا محمد ہادی اور 'رسوؔا' ان کا تخلص تھا۔ان کی پیدائش 1858ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ وہ صرف 16 سال کے تھے جب والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔والدین کی وفات کے بعد بھی انہوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

بارہویں کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا اوراس کے بعد رُڑکی سے انجینیر نگ کی ڈگری حاصل کی۔ انھیں علم کیمیا سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور لکھنؤ واپس آ گئے۔ مرزا رسؔوا کو عربی فارسی، ہندی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں میں بھی مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے انشا پردازی، ناول نگاری اور موسیقی میں بھی کمال حاصل کیا۔

مرزا رسؔوا نے ستمبر **1917**ء میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت مترجم کام کیا، اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی یہاں انھوں نے فلسفہ، منطق، اخلاقیات اور معاشیات کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا۔ **21** اکتوبر **1931**ء کو حیدرآباد میں ہی مرزا رسؔوا کا انتقال ہو گیا۔

مرزا رسؔوا شاعر بھی تھے اور ناول نگار بھی۔ مگر ان کی شاعری کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو ناول نگاری کو ہوئی۔ مرزا کی تصانیف کی تعداد پچاس سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ جس میں کئی ناول ہیں مگر ان ناولوں میں ''شریف زادہ''، ''ذاتِ شریف'' اور ''امراؤ جان ادا'' کو ہی شہرت حاصل ہے، ان میں بھی مرزا کی لافانی شہرت کا سہرا ''امراؤ جان ادا'' کے ہی سر ہے۔

ناول ''امراؤ جان اؔدا'' ایک بدنصیب لڑکی کی داستان ہے جو ایک غریب مگر عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، جسے بچپن میں ہی اغوا کر کے لکھنؤ میں ایک کوٹھے پر بیچ دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی کوٹھے پر ہی گزارتی ہے۔- ناول کے واقعات ناول کے مرکزی کردار ''امراؤ جان'' کے زبانی بیان کرائے گئے ہیں۔ امراؤ جان بڑے سادہ مگر پر اثر انداز میں اپنی بربادی کی داستان اور لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرے کے اتار چڑھاؤ اور غدر کے بعد کے حالات بیان کرتی ہے۔ اگر چہ امراؤ جان ایک طوائف ہے مگر رسؔوا نے اپنی فنی مہارت سے اس کردار کو ایسے تراشا ہے کہ ہمیں اس سے ہمدردی معلوم ہوتی ہے۔ ناول کا اسلوب بہت سادہ ہے، زبان میں سادگی سلاست اور شگفتگی ہے۔

شامل نصاب اقتباس میں ناول کے اس حصے کے حالات درج ہیں جب امراؤ جان 1857ء کے غدر کے بعد کے حالات کا سامنا کرتی ہوئی اپنے آبائی شہر فیض آباد پہنچ جاتی ہے۔حالات کے ہاتھوں مجبور امراؤ جان کے پاس مجرا کرنے کے علاوہ کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ وہ وہیں کرایے کا مکان لے کر رہنےلگتی ہے۔ایک دن اتفاق سے اسی محلے کا مجرا آجاتا ہے جہاں اس کا گھر تھا۔مجرہ کرتے ہوئے امراؤ جان اس جگہ کو پہچان جاتی ہے مجرہ ختم کرنے کے بعد وہ اپنی ماں سے ملتی ہےاور دونوں ماں بیٹی گلےمل کر روتی ہیں یہ بات جب اس کے بھائی کومعلوم ہوتی ہےتو وہ دوسرے دن امراؤ جان سے ملنے آتا ہےاور غیرت کے مارے اس کی گردن پر چھری رکھ دیتا ہےاور بعد میں اس سے یہ شہر چھوڑ کر چلے جانے کی درخواست کر کے واپس چلا جاتا ہے۔

امراؤ جان ادا

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو
اب تمھیں کچھ مری تقریر مزادیتی ہے

بوندی سے بیگم صاحب اور برجیسقدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی، پہلے سرائے میں اتری۔ پھر ترپولیے کے پاس ایک کمرا کرایہ کو لے لیا تھا، میراثی رکھ لیے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھے مہینے گزر چکے ہیں، وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے، دل لگا ہوا ہے، آٹھویں دسویں دن کوئی نہ کوئی مجرا آ جاتا ہے، اسی پر بسر ہے۔ تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے، ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آ جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے مگر انتزاعِ سلطنت، غدر، برجیس قدر یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے، ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے: ''خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو ان کو مجھ سے کیا مطلب۔ وہ

اور عالم میں ہوں گے میں اور عالم میں ہوں، خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔'' گھر کا خیال آتے ہی وہ باتیں دل میں آتی تھیں پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی، مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا، دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے؟ کس کے لیے جاؤں؟ خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا، ان سے اب کیوں کر بنے گی۔ وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا، جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لُٹ گیا، میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا۔ اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اگر نہیں لُٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے میرے ہاتھ گلے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے۔

ایک دن میں کمرے پر بیٹھی ہوں، ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کر دیا، حقّہ بھروایا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں میں سے ہیں، وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں مقبرے کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا:

میں : اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے؟

نواب صاحب: اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا بالکل نیا انتظام ہے۔

میں : اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب : ہاں تھے مگر تم انہیں کیا جانو۔

میں : غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی، انھوں

نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب : وہی جمعدارنا، جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی؟

میں : مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب : یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں : ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب : تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں : اُس دن اُن کے ساتھ۔ ایسی بھی شکل ملتے کم دیکھی ہے، بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب : جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لیے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آ گئی تھی گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آ گیا، اس کی تیاری کرنے لگی جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی۔ محلے کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا، اسی کے نیچے نمگیرا تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں، بہت بڑا مجمع مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے

کھپریلوں میں عورتیں تھیں، پہلا مجرا کوئی **9** بجے شروع ہوا، بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے دہشت سی ہوتی تھی، دل اُمڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے، یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے، ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کو میں نے کبھی دیکھا ہے۔ شبہہ مٹانے کے لیے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہوگئی تھی، اِس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں۔ ماں کے قدموں پر گروں، وہ گلے لگا لیں گی مگر جرات نہ ہوتی تھی، اس لیے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں، دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا: ''ہائے کیا غضب ہے! صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ اُدھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں اُن کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ اک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں کیا مجبوری ہے!''

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آ کے پوچھا: ''تمھیں لکھنؤ سے آئی ہو؟''

میں : ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)

عورت : اچھّا تو ادھر چلی آؤ، تمھیں کوئی بلاتا ہے۔

میں : اچھّا کہہ کے اُس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں سَو سَو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی تھی کہیں اور پڑتا تھا کہیں۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی

ڈیوڑھی میں مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا، اس کے پیچھے دو تین عورتیں آ کے کھڑی ہوئیں۔

ایک : لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟

میں : جی ہاں۔

دوسری : تمھارا نام کیا ہے؟

میں : (جی میں آیا کہ کہہ دوں مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی : تمھارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟

میں : (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی : تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں : (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے، بہ مشکل جواب دیا) جی ہاں!

دوسری : کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں : ذات کی پتریا تو نہیں ہوں، تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔

پہلی : (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر کہو تم کون ہو؟

میں : (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔ (اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں، اب بالکل تاب ضبط نہ تھی، سینے میں دم رُکنے لگا تھا۔)

اتنے میں دو عورتیں پردے سے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا اس نے میرے منہ کو ہاتھ

سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کے دوسری کو دکھایا اور کہا'' کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے''

دوسری : ہائے میری امیرن!

یہ کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آ کے چھڑایا، اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دُہرایا۔ میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا، وہ نگاہ مرتے دم تک نہ بھولے گی۔ مگر مجبوری، روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے پر چلی آئی تھی، دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آ کے کل روپیہ مجرے کا واپس دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا، دولھا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اُس دن دن بھر جو میرا حال رہا، خدا ہی پر خوب روشن ہے کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی آدھی گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی، سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے، سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے پر آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے، ماما کو بلا کے چپکے سے کہا: ''پان لے آؤ'' اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان : کل تمھیں مجرے کو گئی تھیں؟ (یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی)

میں : ہاں۔

اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان : (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

میں : (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان : ہم تو سمجھے تھے کہ تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو۔

میں : بے غیرت زندگی تھی نہ مری، خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان : بے شک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمھیں تو چُلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا، کچھ کھا کے سو رہتیں۔

میں : خود اتنی سمجھ نہ تھی، نہ آج تک کسی نے نیک صلاح دی۔

جوان : اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں، اور آئی بھی تھیں تو اس محلّے میں مجرے کو نہ آنا تھا، جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں : ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا؟

جوان : اچّھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں : اب کیا ہوتا ہے؟

جوان : (بہت ہی غصّہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے! اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) ''یہ ہوتا ہے۔'' اتنے میں ماما بازار

سے پان لے کے آئی۔ اُس نے جو یہ حال دیکھا، لگی چیخنے: ''ارے دوڑو، بیوی کو کوئی مارے دیتا ہے۔''

جوان : (چھری گلے سے ہٹا کے، ہاتھ چھوڑ دیے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون؟ بڑی.....؟

اتنا کہہ کے دہاڑیں مار مار رونے لگا۔

میں پہلے سے رو رہی تھی، جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی، جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجے پر پہنچا تھا۔ اس سے دم بخود ہوگئی تھی جب وہ چھوڑ کر رونے لگا میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں جب اس نے یہ حال دیکھا، کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارے سے منع کیا۔ ایک کنارے کھڑی ہوگئی۔

(جب دونوں خوب رودھو چکے)

جوان : (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں : کل چلی جاؤں گی، مگر ایک دفعہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان : بس اب دل سے دور رکھو، معاف کرو۔ کل اماں نے تمھیں گھر پر بلا لیا۔ میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا۔ محلے بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں : تم نے دیکھ لیا جان سے تو میں ڈرتی نہیں مگر ہائے تمھاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔ خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان : برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں : اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا، میں اپنے غم میں مبتلا تھی، ماما نے اور جان کھانا شروع کی: ''یہ کون تھے؟''

میں : رنڈی کے مکان پر ہزاروں آدمی آتے ہیں، کوئی تھے تمھیں کیا؟

بہرطور ماما کو ٹال دیا۔ رات کی رات سو رہی صبح کو اٹھ کے لکھنؤ چلنے کی تیاری کی۔ شاموں شام شِکرم کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔

معنی اور اشارے:

میراثی	=	گویّا، گانا گانے والے
انتزاع	=	ہاتھ سے نکل جانا، چھن جانا
غدر	=	1857ء کی پہلی جنگ آزادی
کلیجہ پتھر ہونا	=	دل سخت ہونا
وثیقہ	=	وظیفہ۔ وہ رقم جو انگریز حکومت وظیفے کی شکل میں کچھ مخصوص لوگوں کو دیتی تھی
سوز	=	مرثیہ سے پہلے پڑھا جانے والا قطعہ
نمگیرا	=	چھوٹا شامیانہ
بنگلہ	=	فیض آباد کا پرانہ نام
پتریا	=	طوائف
کلیجا ہاتھوں میں اچھلنا	=	بہت زیادہ بے چین ہونا
وارا نیارا	=	حتمی فیصلہ۔ آخری فیصلہ
شکرم	=	چار پہیوں کی گاڑی۔ بگّھی
سانحے	=	حادثے

کثیرالجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions):

(1) ناول کس زبان کا لفظ ہے؟

(a) انگریزی (b) اطالوی

(c) عربی (d) فارسی

(2) اردو کا پہلا ناول نگار کسے کہا گیا ہے؟

(a) پریم چند (b) نذیر احمد

(c) ہادی رسوا (d) کرشن چندر

(3) ناول کے کتنے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں؟

(a) تین (b) پانچ

(c) چار (d) چھ

(4) پریم چند کے سب سے مشہور ناول کا کیا نام ہے؟

(a) نرملا (b) غبن

(c) گئودان (d) گوشۂ عافیت

(5) رسؔوا کا پورا نام کیا تھا؟

(a) مرزا محمد ہادی (b) مرزا شوکت

(c) دھنپت رائے (d) انتظار حسین

(6) رسواؔ کے کس ناول کا اقتباس آپ کے نصاب میں شامل ہے؟

(a) شریف زادہ (b) امراؤ جان ادا

(c) ذات شریف (d) آگ کا دریا

(7) رسواؔ کب پیدا ہوئے تھے؟

(a) 1858ء میں (b) 1857ء میں

(c) 1885ء میں (d) 1895ء میں

(8) رسواؔ کا انتقال کہاں ہوا؟

(a) لکھنؤ میں (b) بلوچستان میں

(c) حیدر آباد میں (d) دلّی میں

(9) ناول ''امراؤ جان ادا'' کا مرکزی کردار کون ہے؟

(a) افسری بیگم (b) خانم

(c) امراؤ جان (d) بسم اللہ

(10) امراؤ جان کہاں کی رہنے والی تھی؟

(a) فیض آباد (b) لکھنؤ

(c) الہ آباد (d) آگرہ

(11) ناول ''امراؤ جان ادا'' میں کس کی کہانی بیان کی گئی ہے؟

(a) ایک عام لڑکی کی (b) ایک طوائف کی

(c) ایک نواب زادی کی (d) ایک بڑھیا کی

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) لفظ ''ناول'' کے کیا معنٰی ہوتے ہیں؟

(2) اردو کا پہلا ناول نگار کسے مانا جاتا ہے؟

(3) ناول کے اجزائے ترکیبی کے نام لکھیے؟

(4) مرزا رسوؔا کہاں پیدا ہوئے تھے؟

(5) مرزا ہادی رسوؔا کا انتقال کس سن میں ہوا؟

(6) مرزا رسوؔا کے دو ناولوں کے نام لکھیے؟

(7) اردو کے چار مشہور ناول نگاروں کے نام لکھیے؟

(8) ناول ''امراؤ جان ادا'' میں کہاں کی تہذیب بیان کی گئی ہے؟

(9) ناول ''امراؤ جان ادا'' میں کس انقلاب کا ذکر ہوا ہے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) مرزا اہادی رسوؔا کی ادبی خدمات پر نوٹ لکھیے؟

(2) ناول کے فن پر مختصر نوٹ لکھیے؟

(3) نصاب میں شامل اقتباس کی روشنی میں ''امراؤ جان'' کے کردار پر روشنی ڈالیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) نصاب میں شامل اقتباس کی روشنی میں امراؤ جان ادا کا خلاصہ اختصار کے ساتھ لکھیے؟

(2) مرزا ہادی رسؔوا کے حالاتِ زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالیے؟

(3) ناول کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے ارتقاء پر تفصیلی نوٹ لکھیے؟

(4) مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح مع سیاق وسباق کیجیے:

''فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گزر چکے ہیں وہاں کی آب وہوا طبیعت کے موافق ہے، دل لگا ہوا ہے، آٹھویں دسویں دن کوئی نہ کوئی مجرا آجاتا ہے، اسی پر بسر ہے۔ تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ دل میں خوش ہوتی ہوں، کبھی کبھی خواب وخیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آجاتی ہیں اور اس کے ساتھ دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے کہ مگر انتزاعِ سلطنت ''غدر''، ''برجیس قدر'' یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے۔''

انشائیہ

انشائیہ کے لغوی معنی ''عبارت'' کے ہیں۔انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی طرح معلوم ہوتی ہے مگر اصلاً ہوتی نہیں ہے۔انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر بے تکلف و بے ساختہ اپنے تاثرات پیش کرتا ہے۔اسی طرح انشائیہ میں ایک قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے۔انشائیہ کا تعلق تخلیقی ادب یا ادبِ لطیف سے بھی ہوتا ہے۔جیسے: داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ۔

دنیا میں جتنے بھی موضاعات ہو سکتے ہیں ان پر انشائیہ لکھا جا سکتا ہے۔انشائیہ میں موضوع کی قید نہیں ہوتی۔مثلاً: علمی، تفریحی، ادبی، ذاتی، سائنسی وغیرہ وغیرہ۔انشائیے میں شگفتگی اور خیال آفرینی ہوتی ہے۔اس لیے اس کی زبان شیریں، نرم و نازک اور بے ساختہ ہوتی ہے۔مشکل الفاظ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔بات اس انداز میں کہی جاتی ہے جو قلم سے نکلے اور دل میں اتر جائے۔

اردو کے اوّلین انشائیہ نگاروں میں سرسید احمد خاں اور ان کے علاوہ الطاف حسین حالؔی، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور کنھیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ نے انشائیہ نگاری کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیئے۔انشائیہ مضمون کی ایک ہیئت ہوتی ہے۔مضمون میں موضوع سے متعلق تمام معلومات فراہم کی جاتی ہے۔جبکہ انشائیہ میں اس کے برعکس موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔وہ جذباتی انداز میں تمام معلومات کو پیش کرنے کے ساتھ ذاتی تاثرات کو بھی شامل کرتا ہے۔

سبق (2) پطرس بخاری

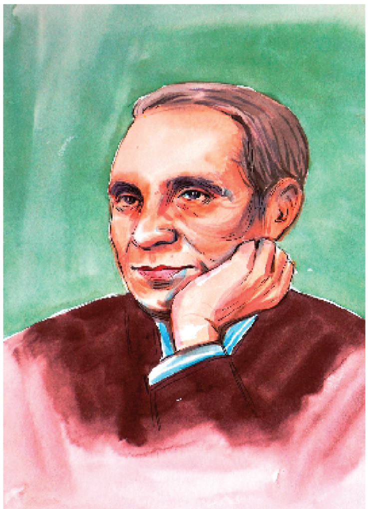

مختصر سوانح

(1) نام : احمد شاہ بخاری

(2) تخلّص : پطرس بخاری

(3) ولادت : **1898**ء پیشاور (پاکستان)

(4) وفات : **1958**ء نیویارک

(5) مشہور تصانیف: مضامینِ پطرس

پطرس بخاری کا اصل نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ ان کی پیدائش پاکستان کے شہر پیشاور میں یکم اکتوبر **1898**ء کو ہوئی۔ ان کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری ایک معروف وکیل خواجہ کمال الدین کے منشی تھے۔ پطرس کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ ان کے والد نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مشن ہائی اسکول میں ان کا داخلہ کر دیا اور انھوں نے وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور آکر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تعلیم سے بہت انھیں دلچسپی تھی اور مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ وقت کا زیادہ تر حصہ کتب بینی میں صرف ہوتا تھا۔

پطرس نے لاہور یونیورسٹی سے **1922**ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کی سند حاصل کی اور

اس کے بعد وہ انگلستان چلے گئے۔ اعلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ انھوں نے اپنی صلاحیت اور لیاقت سے جنوبی ایشیا کے دوسرے طالب علم کا درجہ حاصل کر انگریزی ادب میں اوّل درجے کی سند حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد پطرس اپنے وطن لوٹ آئے۔ اور یہیں معلّمی کے فرائض انجام دینے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد مقرّر رہوئے۔ **1946**ء میں گونمنٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور **1955**ء میں اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات کے ڈپٹی سکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ اس عہدے کے زمانے میں **5** دسمبر **1958**ء کوان کا انتقال نیویارک میں ہوا اور وہیں پر انھیں دفن کر دیا گیا۔

پطرس بخاری کا شمار اردو کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اگر چہ بہت کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا بہترین لکھا۔ پطرس کے مزاج کی بنیادی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔ وہ اپنے طنز و مزاح کا نشانہ اپنی ذات کو بناتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''مضامین پطرس'' کل دس مضامین پر مشتمل ہے۔

زیرِنظر مضمون ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' کا شمار ان کے نمائندہ مضامین میں ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے ایک طالب علم کے اس کرب کا بیان کیا ہے جسے دیر تک سونے کی عادت ہے۔ لیکن امتحان کی تاریخ طے ہونے کے بعد صبح نہ جاگ سکنے کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ پطرس نے صبح نہ جاگ سکنے کی مشکل کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ یہ بات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ کس طرح سامنے کی باتوں کو مزاح کا رنگ دیتے ہیں۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپاشنکر جی برہم چاری سے بہ سبیلِ تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیجیے گا۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے بھوکے بیٹھے تھے، دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ہمارے دروازے پر مکّے بازی شروع کردی۔ کچھ دیر تو ہم سمجھے کہ خواب ہے، ابھی سے کیا فکر کرنا جب جاگیں گے لاحول پڑھ لیں گے، لیکن گولہ باری لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب، جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹ کھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آبا و اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ بھی جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیری آوازیں دیتا ہوں... اچھا... اچھا... تھینک یو... جاگ گیا ہوں... بہت اچھا... نوازش ہے۔ آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے! یہ سوئے ہوئے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں ''قُم'' کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ مردے کے پیچھے لٹھ لے کر

تھوڑا ہی پڑ جاتے تھے؟ تو پیں تھوڑی داغتے تھے؟ یہ تو ہم سے کیسے ہوسکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے، اس کا اندازہ بس اہلِ ذوق خود ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔ اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں۔ سوچا کہ آج پتا لگائیں گے یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے، لیکن جب گھوم گھام کر کھڑکی اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں، ان میں سے ایک بھی نظر نہ آئی تو فکر سا ہوگیا کہ آج سورج گرہن نہ ہو! سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی: لالہ جی!...لالہ جی! جواب آیا ''ہوں۔''

میں نے کہا: ''آج کیا بات ہے کہ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟''

کہنے لگے: ''تو اور کیا تین ہی بجے سے سورج نکل آئے''

یہ تین بجے کا نام سن کر ہوش اُڑ گئے چونک کر پوچھا: ''کیا کہا تم نے تین بجے ہیں؟

کہنے لگے: تین... تو... نہیں... کچھ... سات... ساڑھے... منٹ اوپر تین ہیں''

میں نے کہا: ''ارے اوکم بخت، خدائی فوج دار، بدتمیز کہیں کے! میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا، یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا ہی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو آج دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے؟ تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں کہ کوئی مذاق ہے، لاحول ولاقوّۃ'۔

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیر باد کہہ دوں، مگر پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکا

تو کوئی ہم نے لے نہیں رکھا ہے، ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح دس بجے اٹھے، بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے، شام کا ارمان انگیز وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی، ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ اتنے میں ایک پڑوسی کی آواز آئی: ''مسٹر''۔

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے، بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا: ''آپ گا رہے ہیں؟'' ''زور آپ'' پر۔

میں نے کہا: ''اجی میں کس لائق ہوں، لیکن خیر، فرمائیے''؟

بولے ''ذرا... وہ... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں...''

بس صاحب موسیقیت کی روح ہم میں فوراً مر گئی، دل نے کہا ''او نابکار انسان! دیکھ پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں''۔

صاحب! خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں، ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے''۔

آنسو پونچھ اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے، دانت پیس لیے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھالیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار پڑا

تھا، اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ کھڑا کر دیا، ایک نوٹ پیپر پر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا، پھر پندرہ اپریل تک کے دن گنے صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر منقسم کیا، ساڑھے پانچ سو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے، لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ پر ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے تو لغویات ہے، البتہ پانچ چھ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی، ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سونا چاہیے۔ کھانا باہر ہی کھا آئے تھے، بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں۔ یوں تو ہماری قوت ارادی کافی زبردست ہے، جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی کیا حرج ہے، ڈرتے ڈرتے آواز دی: "لالا جی!''

انھوں نے پتھر کھینچ مارا: ''ییں''!

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ لالہ جی صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں کل ذرا مجھے چھے بجے یعنی جس وقت چھے بجیں...

جواب ندارد...

میں نے پھر کہا: ''جب چھے بج چکیں... سنا آپ نے؟''

چپ۔

''لالہ جی!'' کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا: ''سُن لیا۔ چھے بجے جگا دوں گا۔''

ہم نے کہا: ''ب، ب، ب، بہت اچھا، یہ بات ہے۔''

توبہ، خدا کسی کو محتاج نہ کرے!

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھے بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا، ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو ابھی جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ہی ایک دو منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا کہ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انھوں نے اس صورت میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اُس کے بعد واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں ذرا اختلاف ہے۔ بہرحال اس کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں، پھر یہ یاد ہے کہ ایک نیک اور سچّے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا اور پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پہلے دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی اور پھر کا نہیں پتا۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا یا شاید سر کو اس میں لپیٹ لیا، یا شاید کھانسا، کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے

جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے، یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ ہم۔ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو، یا اس دن چھے دیر بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں! لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو، محض اس شبہے کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سُنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا، مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں، ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجہ کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ آج بھی اور دنوں کی طرح دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجب چیز پیدا کی ہے، یعنی اگر صبح کے بجائے شام ہو جایا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا!''

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے: ''تو میں آپ کو چھے بجے جگا دیا کروں گا؟''

میں نے کہا: ''ہاں ہاں یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک؟

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ رکھ دیں، کرسی کو چارپائی کے نزدیک سرکا لیا، اور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا، کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے، دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا، تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل ہی میں نہایت ہی نیک ارادہ کر کے سو گئے۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی، نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو ''گڈ مارننگ'' کہا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اُٹھے، دل سے کہا کہ ''دل بھیّا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے، ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔'' دل نے کہا: ''اور نہیں تو کیا تمھارے یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔'' ہم نے کہا: ''سچ کہتے ہو یار، یعنی اگر ہم سُستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی مجال کیا ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت لاہور میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا اور مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے، اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دَہَنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار اور سعادت آثار واقع ہوتے ہیں۔''

ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اُسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے ... ''خوب، تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں، بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے، ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبؔر بے چارا یہی کہتے کہتے مر گیا، مگر ہمارے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ (لحاف کانوں پر سرک آیا).....تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں....بہت پہلے... کیا بات ہے؟ خداوندانِ کالج بھی

کس قدر رست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھے بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے... (لحاف سر پر) بات یہ ہے کہ تہذیبِ جدید ہماری تمام اعلاقوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے، عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے...(آنکھیں بند)... تو اب چھے بجے ہیں، تو گویا تین گھنٹے متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے، سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ ''شکسپیر یا ورڈز ورتھ؟'' میں جانوں شکسپیر بہتر ہوگا، اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر کیا چیز ہو سکتی ہے؟'' پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل و دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے... لیکن شکسپیر... نہیں ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے گا... مگر شکسپیر... ہیملٹ... لیکن ورڈز ورتھ... لیڈی میکبتھ ... دیوانگی... سبزہ زار.. سنج سنجر، باد بہاری... صید ہوس... کشمیر... میں آفت کا پر کالہ ہوں...''

یہ معمّا اب فلسفے ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے باہر سر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے، اس میں معلوم کیا بھید ہے۔

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے: ''مسٹر صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی آپ نے کوئی جواب نہ دیا؟''

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا: ''او ہو لالہ جی! یاد نہیں میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔''

بولے: ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں... اس کے بعد... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ بولے ہی نہیں۔

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائی اور غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمُّق میں رہے۔ پھر کیا یک ایک مجوبانہ انداز سے مسکرا کر کہا: ''ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے'' میں اس وقت... اے... اے نماز پڑھ رہا تھا۔ لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زُہد و اِتّقا کی مسکینی میں سر نیچے ڈالے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہ ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا۔ جاگنا نمبر ایک چھے بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

معنی اور اشارے:

برہم چاری = ایسا شخص جو اپنے اوپر پورا قابو رکھتا ہو

بہ سبیل تذکرہ = باتوں باتوں میں

آبا و اجداد = باپ دادا

سحر خیزی = صبح سویرے اٹھنا

جلترنگ = ایک باجا۔ پانی سے بھری بہت سی پیالیاں ایک ہلکی چھڑی سے آہستہ آہستہ ماری جاتی ہیں اور اس طرح آوازوں میں راگ پیدا کیا جاتا ہے۔

قُم = (عربی) اُٹھ، مشہور ہے کہ حضرت عیسٰیؑ مردوں کو "قُم بِاِذْنِ اللّٰہِ" (اللہ کے حکم سے اٹھ) کہہ کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔

آفت = مصیبت

بادِ بہاری = بہار کی ہوا

صبحِ کاذب = صبح صادق سے پہلے جو سفیدی نمودار ہوتی ہے۔

عدم تشدد = طاقت استعمال نہ کرنا۔

بنی نوع انسان = انسانی نسل

ارمان انگیز	=	ارمانوں کو ابھارنے والا
تقطیع	=	سائز
منقسم	=	تقسیم شدہ، بٹا ہوا
ہم خرما ہم ثواب	=	ایک کام سے دو فائدے
طمانیت	=	اطمینان
خندہ پیشانی	=	ہنسی خوشی
اولوالعزمی	=	ہمّت و حوصلہ
سعادت آثار	=	سعادت مند
کسالت	=	کاہلی یا سستی
دنیا اور مافیہا	=	دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے
شگفتہ طبعی	=	خوش مزاجی
غنچہ دہنی	=	مراد مسکراتے ہوئے، جس کا منھ کلی کی طرح چھوٹا لیکن خوبصورت ہو۔
بیخ کنی	=	جڑ سے اکھاڑنا
محشرستان	=	قیامت کا میدان

صیدِ ہوس = ہوس کا شکار

تعمّق = گہرائی

مجوبانہ = شرمندگی لیے ہوئے

زہدواتّقا کی مسکینی = عبادت گزاری، پاکیزگی اور خدا سے ڈرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا انکسار اور غرور سے پاک ہونا۔

گیدڑ کی موت آتی ہے= یہ کہاوت ہے، ایسے موقع پر کہی جاتی ہے جب کوئی شخص ایسا کوئی کام کرڈالے یا کرنے لگے جس میں اس کو تکلیف اور پریشانی ہو، لیکن وہ کام شروع کرتے وقت اس بات کو نہ سمجھے۔اس کہاوت کی اصل غالباً یہ ہے کہ گیدڑ جب شہر میں آنکلتے ہیں (کھانے یا پناہ کی تلاش میں) تو لوگ انھیں مار ڈالتے ہیں یا بھگا دیتے ہیں۔

کثیرالجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) پطرس بخاری کا اصل نام کیا ہے؟

(a) سید بخاری (b) احمد شاہ بخاری

(c) سلطان بخاری (d) اکبر بخاری

(2) پطرس بخاری کی سنہ پیدائش کیا ہے؟

(a) یکم اکتوبر 1898ء　　(b) 5 دسمبر 1958ء

(c) جنوری 2008ء　　(d) نومبر 1955ء

(3) پطرس بخاری کا پسندیدہ ادب کیا تھا جس ادب میں انہوں نے ایم۔اے کی سند حاصل کی؟

(a) ہندی　　(b) اردو

(c) انگریزی　　(d) فارسی

(4) آپ کی کتاب میں شامل پطرس بخاری کے مضمون کا کیا نام ہے؟

(a) مرحوم کی یاد میں　　(b) میں ایک میاں ہوں

(c) مرید پور کا پیر　　(d) سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

(5) پطرس بخاری کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(a) انگلستان　　(b) جرمنی

(c) نیویارک　　(d) لاہور

(6) کس سن میں پطرس کو اقوام متحدہ کا شعبہ اطلاعات کا ڈپٹی سکریٹری جنرل بنایا گیا؟

(a) 1955ء　　(b) 1940ء

(c) 1947ء　　(d) 1958ء

(7) پطرس کی وفات کب ہوئی؟

(a) 1908ء (b) 1958ء

(a) 1950ء (d) 1960ء

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) پطرس بخاری کی سنہ پیدائش کیا ہے؟

(2) پطرس بخاری کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(3) پطرس بخاری نے کس کالج میں معلّمی کے فرائض انجام دیے؟

(4) پطرس بخاری جس کالج کے پرنسپل تھے اس کالج کا نام بتائیے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' کے مصنف کا نام لکھیے؟

(2) لالہ کرپاشنکر جی برہم چاری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، لکھیے؟

(3) لفظ ''قُم'' اور ''صبح کاذب'' کے معنی لکھیے؟

(4) لالہ جی نے مصنف کو جگانے میں کس پہلوانی کا اظہار کیا، لکھیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) مصنف نے الفاظ اور واقعات سے کس طرح مزاح پیدا کیا، بتائیے؟

(2) مصنف نے امتحان کی تیاری کے لیے صبح سویرے اٹھنے کا مسئلہ کس طرح حل کیا، تفصیل میں رقم کیجیے؟

(3) درج ذیل عبارت کا خلاصہ سیاق وسباق کے ساتھ اپنے زبان میں تحریر کیجیے:

”گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہماری شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے بہ سبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیجیے گا۔“

سبق (3) رشید احمد صدیقی

مختصر سوانح

(1) نام : رشید احمد صدیقی

(2) ولادت : **1892**ء جونپور

(3) وفات : **1977**ء علی گڑھ

(4) مشہور تصانیف: خنداں، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، آشفتہ بیانی میری وغیرہ۔

(5) اعزازات: پدم شری، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ۔

رشید احمد صدیقی جونپور کے ایک دیہات مڑیاہوں کے رہنے والے تھے۔ **1892**ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جونپور میں حاصل کی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد علی گڑھ آ گئے۔ مالی حالت سے مجبور ہو کر کچہری میں ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ملازمت کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور فارسی سے ایم اے کیا۔ آپ نے طالب علمی کے زمانے سے ہی مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کر دیا تھا۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے **1922**ء میں وہیں کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اور جب یونیورسٹی بنی اور اردو ادب کا شعبہ

قائم ہوا تو رشید احمد صدیقی صاحب کو صدرِ شعبہ بنا دیا گیا۔ علی گڑھ کو ہی انھوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور وہیں رہ کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول رہے۔ **1977**ء میں علی گڑھ میں وفات پائی۔

رشید احمد صدیقی صاحب کو شروع سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنی انشاپردازی کا سکہ بیٹھا دیا۔ ان کی مخصوص انشاپردازی ان کی انفرادیت کی ضامن ہے۔ علی گڑھ میگزین میں بھی ان کے مزاحیہ مضامین بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے خاکے ہو یا انشائیہ یا علمی مضامین وہ باوقار ظرافت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان کی نثر میں طنز کا بھرپور وار ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کی شائستہ ظرافت پائی جاتی ہے۔ عام طور پر رمز و کنایہ سے کام لیتے ہیں۔ ملتے جلتے لفظوں کو اس خوبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ نثر بوجھل معلوم نہیں ہوتی۔ ان کی عبارت خیال کی بلندی اور الفاظ کی ترتیب کی وجہ سے اکثر عام فہم نہیں ہوتی۔ ہر قدم پر وہ صرف مخصوص واقعات کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں۔ اس لئے اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے بڑی توجہ اور انہماک کی ضرورت ہے۔ ان کے موضوعات میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ معاشرتی، سیاسی اور ادبی مسائل پر جب وہ اپنے مخصوص انداز میں قلم اٹھاتے ہیں تو قاری ان کی طرز تحریر کی دلکشی و نزاکت اور ان کے خیالات کی دوررسی اور گہرائی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے یہاں دلچسپ فقروں، نادر تشبیہوں، لطیف اشاروں، برجستہ لطیفوں اور پرکشش انداز بیان کی وجہ سے ادبیت کی شان پیدا ہوگئی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی بیشتر نگارشات انشائیہ کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کے یہاں انشائیہ کا فن

اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ڈاکٹر، دیہاتی، وکیل صاب، ارہر کا کھیت، مغالطہ اور گھاگ وغیرہ ان کے اپنے انشائیہ ہیں جن کی دلکشی کبھی کم نہ ہوگی۔

مضامین رشید (مزاحیہ طنزیہ مضامین کا مجموعہ) خنداں (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ) ہم نفسان رفتہ (خاکوں کے مجموعے) آشفتہ بیانی میری (خودنوشت) جدید غزل رشید صاحب کی اہم تصانیف ہیں۔

زیرِ نظر مضمون ''چارپائی'' ان کے بے حد مقبول انشائیہ ہیں۔اس میں تخلیقی شان بھی ہے اور اعلیٰ ادبی ظرافت بھی۔اس میں مقامی اور ملک کے دیگر مسائل کو نہایت ہنر مندی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے زورِ قلم سے اس کی اہمیت وافادیت کو اپنے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ ''چارپائی'' کی اہمیت مسلم ہوجاتی ہے۔

چارپائی

چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسے، آفس، جیل خانے، کونسل یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔ چارپائی ہماری گھُٹّی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں، دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں کبھی فکرِسخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِقوم۔ اکثر فاقہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی-سی-ایس پر، شاعر کو قافیے پر یا طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے، اس لیے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب "ولایت پاس" ہو کر آئے۔ ریاست میں کوئی اسامی نہ تھی جو اُن کو دی جاسکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے، راجا صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچادی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے طے کر آئے ہیں، راجا صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہل چل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے، یہ ان کی جگہ پر تعینات کر دیے گئے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینیر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے اور اپنے ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوا دینے کی فکر میں تھے۔

یہی حالت چار پائی کی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ کار آمد ہوتی ہے۔فرض کیجیے آپ بیمار ہیں سفرِ آخرت کا سامان میسر ہو یا نہ ہو، اگر چار پائی آپ کے پاس ہے تو دنیا میں آپ کو کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پڑیا تکیے کے نیچے، جوشاندے کی دیگچی سرہانے رکھی ہوئی، بڑی بیوی طبیب، چھوٹی بیوی خدمت گزار، چار پائی سے ملا ہوا بول و براز کا برتن، چار پائی کے نیچے میلے کپڑے بچّوں کے کھلونے، جھاڑو، آش جو، روئی کے پھاہے، کاغذ کے ٹکڑے، مچّھر، بھُنگے، گھر یا محلّے کے دو ایک بچّے، جن میں ایک آدھ زُکام خسرے میں مبتلا۔اچّھے ہو گئے تو بیوی نے چار پائی کھڑی کر کے غسل کرا دیا، ورنہ آپ کے دشمن اُسی چار پائی پر لبِ گور لائے گئے۔

ہندوستانی گھرانوں میں چار پائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، خیمہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ سب کی حیثیت کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل رہتی ہے۔کوئی مہمان آیا چار پائی نکال دی گئی۔اس پر ایک نئی دری بچھا دی گئی جس کے تہ کے نشان ایسے معلوم ہوں گے جیسے کسی چھوٹی سی آراضی کو مینڈوں اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مہمان صاحب مع اچکن، ٹوپی، بیگ بُغچی کے بیٹھ گئے۔اور تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا کہ مہمان بے وقوف ہے یا میزبان بدنصیب: چار پائی ہی پر ان کا منھ ہاتھ دھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چار پائی پر یہ سو رہیں گے۔سو جانے کے بعد ان پر سے مچّھر مکّھی اسی طرح اڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خونچے پر سے جھاڑو نما مورچھل سے مکّھیاں اڑا رہا ہو۔

چار پائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جائے گا جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی، دانے چگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی۔کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چار پائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رخصت جمع ہوتی رہتی ہے اس کو لے کر ملازمت سے سبک دوش

ہو جاتے ہیں۔اس طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال کوٹھری میں داخل کر دیتے ہیں اوراس پہ سال بھر کا پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ایک دفعہ دیہات کے ایک میزبان نے پیاز ہٹا کر اس خاکسار کو ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی پر اسی کال کوٹھری میں بچھا دیا تھا اور پیاز کو چارپائی کے نیچے اکٹھا کر دیا گیا تھا۔اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہو گئے تھے جتنی ساری پیازوں میں چھلکے تھے اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے۔

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے۔تکیے کے نیچے ہر قسم کی گولیاں جن کے استعمال سے آپ کے سوا کوئی اور واقف نہیں ہوتا۔ایک آدھ روپیہ چند ڈھیلے پیسے،اسٹیشنری کتابیں،رسالے، جاڑے کے کپڑے تھوڑا بہت ناشتہ،نقش سلیمانی فہرست دواخانہ سمّن جعلی دستاویز کے کچھ مسوّدے، یہ سب چارپائی میں آباد ملیں گے۔میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چارپائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو، اجالا ہو یا اندھیرا،اس صحت کے ساتھ آنکھ بند کر کے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے تھے۔

حکومت بھی چارپائی ہی پر سے ہوتی ہے۔خاندان کے کرتا دھرتا چارپائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں، وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور ہر گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا میں ہاتھ پاؤں، زبان کے علاوہ ڈنڈا، جوتا، تاملوٹ بھی ہیں جنھیں اکثر پھینک کر مارتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ تَوَقُّف کرنے میں غصے کا تاؤ مدّھم نہ پڑ جائے اور ان آلات کو مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

چارپائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔باورچی خانے سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانچ سات چھوٹے بڑے بچے، اتنی ہی مرغیاں، دو ایک کتّے، بلّی اور بے شمار مکھیاں آ پہنچیں۔سب اپنے قرینے

سے بیٹھ گئے۔ صاحب خانہ صدر دستر خوان ہیں۔ایک بچہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے، دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر، تیسرا کم کھانے پر، چوتھا زیادہ کھانے پر اور بقیہ اس پر کہ ان کو مکھیاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکّھی اڑاتی جاتی ہے اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا۔شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھو کر فکر سخن میں چارپائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے جیسے گھر میں آگ لگی ہے۔اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے بیوی بچے بدن دبانے لگے۔

چارپائی ہندوستان کی آب وہوا تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مانند ڈھیلی ڈھالی، شکستہ حال، بے سروسامان لیکن ہندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمراں کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لیے آمادہ کوچ اور صوفے کے دلدادہ اور ڈرائنگ روم کے اسیر اُس راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چارپائی پر میسر آتی ہے! شعرا نے انسان کی خوشی اور خوشحالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں، مثلاً سچے دوست، شرافت، فراغت، اور گوشۂ چمن۔ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے عیش و فراغت کی فہرست اس سے مختصر ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چارپائی ان تمام لوازم کو پورا کر سکتی ہے۔

معنی اور اشارے:

فکرِ سخن کرنا = شعر موزوں کرنا یا موزوں کرنے کے کام میں مصروف ہونا۔

آئی-سی-ایس = انڈین سوِل سروس- اب اسے آئی اے ایس (انڈین ایڈ منسٹریٹو سروس) کہتے ہیں۔

اسامی = نوکری

بَول = پیشاب

براز = پاخانہ

آش جو = جو کا جوش دیا ہوا پانی جو بہت کم زور مریضوں کی دیا جاتا ہے۔

آراضی = زمین، کھیت، زمین کا وہ حصہ جس پر کاشت کی جائے

نقشِ سلیمانی = ایک طرح کا تعویذ

سمّن = عدالت میں حاضر ہونے کا بلاوا **(Summons)**

ولایت = غیر ملک

تعیّنات کرنا = مقرر کرنا

حاجت = ضرورت

لبِ گور = قبر کا کنارہ، مراد قبر

ذخیرہ = ڈھیر

طبق روشن ہونا = بصیرت پیدا ہونا، عقل و مزاحت بڑھ جانا، حیرت میں پڑ جانا

نقش سلیمانی = ایک طرح کا تعویذ

مسودے = ایسی تحریر جسے ابھی حتمی شکل نہیں دی گئی ہو

قیلولہ = دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنا

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) رشید احمد صدیقی کا سنہ وفات ہے؟

(a) 1975ء (b) 1970ء

(c) 1980ء (d) 1977ء

(2) رشید احمد صدیقی کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) جونپور (b) بنارس

(c) الہ آباد (d) اعظم گڑھ

(3) ''آشفتہ بیانی میری'' کا تعلق ہے؟

(a) ریڈیائی تقریروں سے (b) مزاحیا مضامین سے

(c) خاکوں سے (d) خودنوشت سے

(4) ''وکیل صاحب'' کس کا مضمون ہے؟

(a) پطرس بخاری (b) رشید احمد صدیقی

(c) رگھوپتی سہائے (d) کنھیالال کپور

مختصرترین سوالات (Very short type questions):

(1) رشید احمد صدیقی کہاں کے رہنے والے تھے؟

(2) رشید احمد صدیقی کے کسی تین تصانیف کے نام لکھیے؟

(3) رشید احمد صدیقی کے کسی دو انشائیہ کے نام بتائیے؟

(4) زیرنظر مضمون ''چار پائی'' میں مصنف نے چار پائی کی مثال کس سے دی ہے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) چار پائی میں رشید احمد صدیقی نے ہندوستانی معاشرت کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے مختصراً بیان کیجیے؟

(2) اس مضمون میں مصنف نے چار پائی کی مثال ریاست کے ملازم سے کیوں دی ہے؟

(3) اس مضمون میں رشید احمد صدیقی نے چار پائی کی کیا اہمیت بتائی ہے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) ''چار پائی'' کا جو پیراگراف آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔اس کا مطلب اپنے انداز میں لکھیں؟

(2) اس مضمون میں جو محاورے در آئے ہیں ان کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے؟

(3) رشید احمد صدیقی کے اسلوب تحریر پر روشنی ڈالیے؟

افسانہ

افسانہ ادب کی ایک نثری صنف ہے۔ اصطلاح میں افسانہ ایسی کہانی کو کہتے ہیں جس کو مختصر وقت میں پڑھا جا سکے۔ اس میں کسی واقعے کا بیان ہوتا ہے۔ اس کے لیے ابتدا، ارتقا اور خاتمے کا ہونا ضروری ہے۔ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ اختصار، جامعیت اور وحدت تأثُّر اس کے خاص اوصاف ہیں۔

اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہوتا ہے۔ اوّلین افسانہ نگار کون ہے، اس سلسلے میں محققین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے علامہ راشد الخیری کو، بعض نے سجاد حیدر یلدرم کو اور بعض نے پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے، لیکن اکثریت کے نزدیک پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار ٹھہرتے ہیں۔ ابتدا میں دو طرح کے افسانے لکھے گئے۔ اول حقیقت پسند افسانے اور دوم رومان پسند افسانے، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری نے اردو میں رومانی افسانے لکھے اور پریم چند اور ان کے ہم خیال افسانہ نگاروں نے حقیقت پسند افکار و تصورات پر مبنی افسانے تخلیق کیے۔ پریم چند نے افسانہ نگاری میں جو روش اختیار کی وہی حقیقت پسندانہ روش بعد کے افسانہ نگاروں نے بھی اختیار کی۔ 1932ء میں ''انگارے'' نام کی کتاب شائع ہوئی جس کے افسانوں میں فرسودہ

خیالات وتصورات، نظریات ومتعقدات پر ضرب کاری نکالی گئی۔ اس کے بعد **1936**ء میں ترقی پسند دور کا آغاز ہوا اور اس کے تحت کثیر تعداد میں افسانے لکھے گئے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سہیل عظیم آبادی، غلام عباس وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ **1960**ء کے بعد اردو افسانہ کی ہئیت اور تکنیک میں تبدیلی آئی اور تمثیلی، تجریدی اور علامتی افسانے ظہور میں آئے۔ افسانہ ادب کی ایک مقبول صنف ہے اور زمانۂ حاضر میں بھی افسانے تخلیق کیے جا رہے ہیں۔

عام طور سے پلاٹ، کردار، مکالمہ، اسلوب اور آغاز و اختتام افسانے کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ لیکن انفرادیت پسند افسانہ نگاروں نے اس کے اجزائے ترکیبی میں بھی جدّت طرازی کا مظاہر کر کے فن کے نئے نمونے پیش کیے ہیں۔

سبق (4) کرشن چندر

مختصر سوانح

(1) نام : کرشن چندر

(2) ولادت : 23 نومبر 1914ء پنجاب

(3) وفات : 8 مارچ 1977ء بمبئی

(4) مشہور تصانیف: طلسم خیال، نظارے،
ہم وحشی ہیں وغیرہ

(5) اعزاز : پدم بھوشن ایوارڈ

پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو میں اپنا سِکّہ جمایا، ان میں کرشن چندر کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی ہر دل عزیزی اپنی مثال آپ تھی۔ ان کا اصل تعلق سرزمین کشمیر سے تھا۔ 1914ء میں وزیر آباد ضلع گجرانوالہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام گوری شنکر تھا جو پیشے سے ڈاکٹر تھے اور جموں میں تعینات تھے۔ اس لیے ان کا بچپن کشمیر میں گزرا۔ وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ جہاں سے انھوں نے ایم۔ اے۔ انگریزی کے امتحان پاس کیے۔ وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی اور وکالت شروع کی۔ چونکہ طبیعت کو اس پیشے سے مناسبت نہ تھی اس لیے اسے ترک کر دیا۔ پھر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ مگر جلد ہی اس ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور

افسانہ نگاری میں مصروف ہو گئے۔ ان کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ بالآخر یہی پیشہ ہو گیا اور ان کا سارا وقت اسی شغل میں بسر ہونے لگا۔ **1940** ء میں لاہور سے دہلی آ گئے اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہ ملازمت بھی دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ آخر کار استعفیٰ دے کر ممبئی چلے گئے۔ جہاں وہ فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے اور مستقل طور پر ممبئی میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ ناول نگاری اور افسانہ نگاری اصل مشغلہ تھا۔ وہ اخیر وقت تک جاری رہا۔ **1977** ء میں وفات پائی۔

1969 ء میں حکومت ہند کی جانب سے کرشن چندر کو پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا۔ اس کے علاوہ کئی اداروں اور انجمنوں نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اعزازات سے نوازا۔

کرشن چندر تقریباً **80** کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے ناول لکھے، ریڈیو ڈرامے لکھے، رپوتاژ اور مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کی اصل شہرت کہانیوں کی وجہ سے ہے۔ ان کے ناولوں میں شکست، جب کھیت جاگے، میری یادوں کے چنار، کاغذ کی ناؤ اور آسمان روشن ہے قابل ذکر ہیں۔ کہانیوں کے قابلِ ذکر مجموعوں میں طلسم خیال، نظارے، زندگی کے موڑ پر، ٹوٹے ہوئے تارے، ان داتا، تین غنڈے، سمندر دور ہے، اجنتا کے آگے، ہم وحشی ہیں اور دل کسی کا دوست نہیں اہم ہیں۔ کرشن چندر دراصل بسیار نویس تھے اور اسی بسیار نویسی نے ان کے فن کو نقصان پہنچایا۔

کرشن چندر مزاجاً رومان پرور اور جذبات پسند تھے۔ حسن پرستی، جذباتیت، فطرت سے بے پناہ لگاؤ، اور بے لوث محبت نے مل کر ان کے افسانوں میں ایسی کشش اور تاثیر پیدا کر دی ہے کہ دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچتا چلا آتا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان بڑی جذباتی، شیریں، رنگین اور جاندار ہے۔ زبان کی لطافت کو بھی انھوں نے بہت اہمیت دی ان کے افسانوں میں بلند و پست سب کچھ ہے لیکن ان کے بہترین افسانے رومان پروری، حسن کاری، فطرت پرستی، انسان دوستی، بہتر سماج کی آرزومندی اور

رومان وحقیقت کی حسین آمیزش کے باعث باذوق قارئین کی توجہ کا مرکز بنے رہیں گے۔

زیرِ نصاب شامل افسانہ ''پورے چاند کی رات'' دو معصوم دلوں کی کہانی ہے جس میں حقیقت و رومان کا دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔ محبت کی عکاسی بھی اس کہانی میں انسان کے مقدس اور معصوم جذبات دل کی طرح دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

پورے چاند کی رات

اپریل کا مہینا تھا۔ بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں اور ہوا میں برفیلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آگئی تھی۔ بلند و بالا تنگوں کے نیچے مخملیں دوب پر کہیں کہیں برف کے ٹکڑے سپید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آرہے تھے اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے، اور دوب کا رنگ گہرا سبز ہو جائے گا، اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے بادام پکھراج کے نگینوں کی طرح جھلملا ئینگے، اور نیلگوں پہاڑوں کے چہروں سے کہرا دور ہوتا جائے گا، اور اس جھیل کے پل کے پار پگڈنڈی کی خاک ملائم بھیڑوں کی جانی پہچانی بآ آ سے جھنجھنا اٹھے گی، اور پھر ان بلند و بالا تنگوں کے نیچے چرواہے بھیڑوں کے جسموں سے سردیوں کی پلی ہوئی موٹی موٹی گف اون گرمیوں میں کترتے جائیں گے اور گیت گاتے جائیں گے۔

لیکن ابھی اپریل کا مہینا تھا۔ ابھی تنگوں پتیاں نہ پھوٹی تھیں۔ ابھی پہاڑوں پر برف کا کہرا تھا۔ ابھی پگڈنڈی کا سینہ بھیڑوں کی آواز سے گونجا نہ تھا۔ ابھی سمل کی جھیل پر، کنول کے چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جھیل کا گہرا سبز پانی اپنے سینے کے اندر ان لاکھوں روپوں کو چھپائے بیٹھا تھا جو بہار کی آمد پر یکا یک اس کی سطح پر ایک معصوم اور بے لوث ہنسی کی طرح کھل جائیں گے۔ پل کے کنارے کنارے بادام کے

پیڑوں کی شاخوں پر شگوفے چمکنے لگے تھے۔ اپریل میں زمستاں کی آخری شب میں جب بادام کے پھول جاگتے ہیں۔ اور بہار کے نقیب بن کر جھیل کے پانی میں اپنی کشتیاں تیراتے ہیں پھولوں کے ننھے شکارے سطحِ آب پر رقصاں ولرزاں بہار کی آمد کے منتظر ہیں۔

پُل کے جنگلے کا سہارا لے کر میں ایک عرصے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سہ پہر ختم ہوگئی۔ شام آ گئی جھیل وُلر کو جانے والے ہاؤس بوٹ پل کی سنگلاخی محرابوں کے بیچ میں سے گزر گئے اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کا قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلتا گیا اور قرمزی سے سرمئی اور سرمئی سے سیاہ ہوتا گیا حتٰی کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگڈنڈی بھی سوگئی اور پھر رات کے سناٹے میں پہلا تارا کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا کی خنکی تیز تر ہوتی گئی اور نتھنے اس کے برفیلے لمس سے سن ہو گئے۔

اور پھر چاند نکل آیا

اور پھر وہ آ گئی

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی، بلکہ پگڈنڈی کے ڈھلان پر دوڑتی ہوئی۔ وہ میرے قریب آ کے رک گئی، اس نے آہستہ سے کہا:

''ہائے!''

اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی، پھر رک جاتی، پھر تیزی سے چلنے لگتی۔ اس نے میرے

شانے کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پھر اپنا سر وہاں رکھ دیا اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کا پریشان گھنا جنگل دور تک میری روح کے اندر پھیلتا چلا گیا اور میں نے اس سے کہا:

''سہ پہر سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔''

اس نے ہنس کر کہا: ''اب رات ہوگئی ہے، بڑی اچھی رات ہے یہ'' اس نے اپنا کمزور ننھا چھوٹا سا ہاتھ میرے دوسرے شانے پر رکھ دیا اور جیسے بادام کے پھولوں سے بھری شاخ جھک کر میرے کندھے پر سو رہی۔

دیر تک وہ خاموش رہی۔ دیر تک میں خاموش رہا پھر وہ آپ ہی آپ ہنسی بولی: ''ابا میرے پگڈنڈی کے موڑ تک میرے ساتھ آئے تھے، کیوں کہ میں نے کہا، مجھے ڈر لگتا ہے۔ آج مجھے اپنی سہیلی رجو کے گھر سونا ہے، سونا نہیں ہے، جاگنا ہے کیونکہ بادام کے پہلے شگوفوں کی خوشی میں ہم سب سہیلیاں رات بھر جاگیں گی اور گیت گائیں گی اور یہی تو سہ پہر سے تیاری کر رہی تھی ادھر آنے کی۔ لیکن دھان صاف کرنا تھا اور کپڑوں کا یہ جوڑا کل دھویا تھا آج سوکھا نہ تھا۔ اسے آگ پر سکھایا اور اماں جنگل سے لکڑیاں چننے گئی تھیں، وہ ابھی آئی نہ تھیں۔ اور جب تک وہ نہ آتیں میں مکئ کے بھٹے اور خشک خوبانیاں اور جر والو تمہارے لیے کیسے لا سکتی ہوں۔ دیکھو یہ سب کچھ لائی ہوں تمھارے لیے۔ ہائے تم تو سچ مچ خفا کھڑے ہو۔ میری طرف دیکھو میں آ گئی ہوں۔ آج پورے چاند کی رات ہے.... آؤ کنارے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور جھیل کی سیر کریں۔''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اور میں نے اس کی محبت اور حیرت میں گم پتلیوں کو دیکھا جن

میں اس وقت چاند چمک رہا تھا اور یہ چاند مجھ سے کہہ رہا تھا: جاؤ کشتی کھول کے جھیل کے پانی پر سیر کرو۔ آج بادام کے پیلے شگوفوں کا مسرت بھرا تیوہار ہے۔ آج اس نے تمہارے لیے اپنی سہیلیوں، اپنے ابا، اپنی ننّھی بہن، اپنے بڑے بھائی سب کو فریب میں رکھا ہے، کیونکہ آج پورے چاند کی رات ہے اور بادام کے سپید خنک شگوفے برف کے گالوں کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں بچے کے دودھ کی طرح امنڈ آئے ہیں۔ اس کی گردن میں تم نے موتیوں کی یہ ست لڑی دیکھی۔ یہ سرخ ست لڑی اس کے گلے میں ڈال دی اور اس سے کہا: ''تو آج رات بھر جاگے گی۔ آج کشمیر کی بہار کی پہلی رات ہے۔ آج تیرے گلے سے کشمیر کے گیت یوں کھلیں گے جیسے چاندنی رات میں زعفران کے پھول کھلتے ہیں یہ سرخ ست لڑیاں پہن لے''۔

چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران پتلیوں سے جھانک کے دیکھا پھر یکا یک کہیں کسی پیڑ پر ایک بلبل نغمہ سرا ہو اٹھی اور کشتیوں میں چراغ جھلملانے لگے اور تنگوں سے پرے بستی میں گیتوں کی مدھم صدا بلند ہوئی گیت اور بچوں کے قہقہے اور مردوں کی بھاری آوازیں اور ننّھے بچّوں کے رونے کی میٹھی صدائیں چھتوں سے ادر زندگی کا آہستہ آہستہ سلگتا ہوا دھواں اور شام کے کھانے کی مہک مچھلی اور بھات اور کڑم کے ساگ کا نرم نمکین اور لطیف ذائقہ اور پورے چاند کی رات کا بہار آفریں جوبن میرا غصہ ڈھل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کہا: ''آؤ چلیں جھیل پر۔''

پل گزر گیا۔ پگڈنڈی گزر گئی، بادام کے درختوں کی قطار ختم ہوگئی۔ اب ہم جھیل کے کنارے

کنارے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں میں مینڈک بول رہے تھے۔ مینڈک اور جھینگر اور مینڈے، ان کی بے ہنگم صداؤں کا شور بھی ایک نغمہ بن گیا تھا۔ ایک خواب ناک سمفنی اور سوئی ہوئی جھیل کے بیچ میں چاند کی کشتی کھڑی تھی۔ ساکن چپ چاپ، محبت کے انتظار میں ہزاروں سال سے اس طرح کھڑی تھی۔ میری اور اس کی محبت کی منتظر تمھاری اور تھارے محبوب کی مسکراہٹ کی منتظر، انسان کے انسان کو چاہنے کی آرزو کی منتظر، یہ پورے چاند کی حسین پاکیزہ رات محبت کے مقدس لمس کی منتظر ہے۔

کشتی خوبانی کے ایک پیڑ سے بندھی تھی، جو بالکل جھیل کے کنارے اگا تھا۔ یہاں پر زمین بہت نرم تھی اور چاندنی پتوں کی اوٹ سے چھنتی ہوئی آرہی تھی اور مینڈک ہولے ہولے گارہے تھے اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چومتا جاتا تھا اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آرہی تھی.... جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے۔ نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو کے صدہا گیت گانے لگے۔ اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں۔ دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں اڑنے والے بادل سب مل کر ناچنے لگے پھر کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے کلیوں کی طرح۔ اور گیت بلند ہو ہو کے مدھم ہوتے گئے اور ناچ دھیما پڑتا پڑتا رک گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی وہی جھیل کے نرم نرم بوسے۔

میں نے آہستہ سے کشتی کھولی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے چپو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کشتی کو کھے کر جھیل کے مرکز میں لے گیا۔ یہاں کشتی آپ ہی آپ کھڑی ہوگئی، نہ ادھر بہتی تھی نہ ادھر۔ میں نے چپو

اٹھا کر کشتی میں رکھ لیا۔ اس نے پوٹلی کھولی اس میں سے جر والو نکال کے مجھے دیے۔ خود بھی کھانے لگی۔ جر والو خشک تھے اور کھٹے میٹھے۔

وہ بولی یہ پچھلی بہار کے ہیں۔

میں جر والو کھاتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ آہستہ سے بولی:

''پچھلی بہار میں تم نہ تھے۔''

پچھلی بہار میں میں نہ تھا، اور جر والو کے پیڑ پھولوں سے بھر گئے تھے۔ اور ذرا سی شاخ ہلانے پر پھول ٹوٹ کر سطح زمین پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے پچھلی بہار میں میں نہ تھا اور جبر والو کے پیڑ پھلوں سے لدے پھندے تھے۔ سبز سبز جر والو۔ سخت کھٹے جر والو جو نمک مرچ لگا کے کھائے جاتے تھے اور زبان سی سی کرتی تھی اور ناک بہنے لگتی تھی۔

جر والو کھا کے ہم نے خشک خوبانیاں کھائیں۔ خوبانی پہلے تو بہت میٹھی معلوم نہ ہوتی مگر جب دہن کے لعاب میں گھل جاتی تو شہد وشکر کا مزہ دینے لگتی۔

''نرم نرم بہت میٹھی ہیں یہ'' میں نے کہا۔

اس نے ایک گٹھلی کو دانتوں سے توڑا اور خوبانی کا بیج نکال کر مجھے دیا: ''کھاؤ'' بادام کی طرح میٹھا ہے۔

''ایسی خوبانیاں میں نے کبھی نہیں کھائیں۔

اس نے کہا: ''یہ ہمارے آنگن کا پیڑ ہے۔ ہمارے یہاں خوبانی کا ایک ہی پیڑ ہے۔ مگر اتنی بڑی سرخ اور میٹھی خوبانیاں ہوتی ہیں اس کی کہ میں کیا کہوں۔ جب خوبانیاں پک جاتی ہیں تو میری سہیلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اور خوبانیاں کھلانے کو کہتی ہیں... پچھلی بہار میں...

اور میں نے سوچا پچھلی بہار میں میں نہ تھا مگر خوبانی کا پیڑ آنگن میں اسی طرح کھڑا تھا پچھلی بہار میں وہ نازک پتوں سے بھر گیا تھا۔ پھر ان میں کچی خوبانیوں کے سبز اور نکیلے پھل لگے تھے۔ ابھی ان خوبانیوں میں گٹھلی پیدا ہوئی تھی اور یہ کچے کھٹے پھل دوپہر کے کھانے کے ساتھ چٹنی کا کام دیتے تھے۔ پچھلی بہار میں نہ تھا اور ان خوبانیوں میں گٹھلیاں پیدا ہو گئی تھیں اور خوبانیوں کا رنگ ہلکا سنہرا ہونے لگا تھا۔ اور گٹھلیوں کے اندر نرم نرم بیج اپنے ذائقے میں سبز باداموں کو بھی مات کرتے تھے۔

خوبانیاں کھا کے اس نے مکئی کا بھٹا نکالا ایسی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ سنہرا سینکا ہوا بھٹا اور کرکرے دانے صاف شفاف موتیوں کی سی کی جلا لیے ہوئے اور ذائقے میں بے حد شیریں۔

وہ بولی: ''یہ مصری مکئی کے بھٹے ہیں۔'' بے حد میٹھے، میں نے بھٹا کھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی: '' پچھلی فصل کے رکھے تھے، گھڑوں میں چھپا کے۔ اماں کی آنکھ سے اوجھل۔''

میں نے بھٹا ایک جگہ سے کھایا۔ دانوں کی چند قطاریں رہنے دیں پھر اس نے اسی جگہ سے کھایا اور دانوں کی چند قطاریں میرے لیے رہنے دیں جنہیں میں کھانے لگا اور اس طرح ہم دونوں ایک ہی بھٹے

سے کھاتے گئے اور میں نے سوچا: یہ مصری مکئی کے بھٹّے کتنے میٹھے ہیں یہ پچھلی فصل کے بُھٹّے ، جب تو تھی میں نہ تھا۔ جب تیرے باپ نے ہل چلایا تھا کھیتوں میں گوڑی کی تھی ، بیج بوئے تھے، بادلوں نے پانی دیا تھا۔ زمین نے سبز سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اگائے تھے، جن میں تو نے نلائی کی تھی۔ پھر پودے بڑے ہو گئے تھے اور ہوا میں جھومنے لگے تھے، اور تو مکئی کے پودوں پر ہرے ہرے بھٹے دیکھنے جاتی تھی جب میں نہ تھا۔ لیکن بھٹوں کے اندر دانے پیدا ہو رہے تھے، دودھ بھرے دانے، جن کی نازک جلد کے اوپر اگر ذرا سا بھی ناخن لگ جائے تو دودھ باہر نکل آتا ہے۔ ایسے نرم نازک بھٹّے اس دھرتی نے اگائے تھے اور میں نہ تھا۔ دھرتی تھی تخلیق تھی، محبت کے گیت تھے۔ آگ پر سینکے ہوئے بھٹے تھے لیکن میں نہ تھا۔

میں نے مسرّت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: ’’آج پورے چاند کی رات کو جیسے ہر بات پوری ہو گئی ہے‘‘۔

اس نے بھٹّا میرے منہ سے لگا دیا۔ اس کے ہوٹوں کا گرم گرم نمناک لمس ابھی تک اس بُھٹّے پر تھا۔

وہ پورے چاند کی رات مجھے اب تک نہیں بھولتی۔ میری عمر ستر برس کے قریب ہے، لیکن وہ پورے چاند کی رات میرے ذہن میں اس طرح چمک رہی ہے جیسے ابھی وہ کل آئی تھی۔ ایسی پاکیزہ محبت میں نے آج تک نہیں کی ہوگی۔ اس نے بھی نہیں کی ہوگی۔ وہ جادو ہی کچھ اور تھا جس نے پورے چاند کی رات کو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یوں ملا دیا کہ وہ پھر گھر نہیں گئی۔ اور ہم محبت میں کھوئے ہوئے بچوں کی طرح ادھر ادھر جنگلوں کے کنارے ندی نالوں پر اخروٹوں کے سائے تلے گھومتے رہے، دنیا و مافیہا سے بے فکر

میں نے اسی جھیل کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا اور اس میں ہم دونوں رہنے لگے کوئی ایک مہینے کے بعد میں سری نگر گیا اور اس سے یہ کہہ کے گیا کہ تیسرے دن لوٹ آؤں گا تیسرے دن میں لوٹ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک نوجوان سے گھل مل کے باتیں کر رہی ہے۔ وہ دونوں ایک ہی رکابی میں کھانا کھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں۔ میں نے انھیں دیکھ لیا لیکن انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی مسرّت میں اس قدر محو تھے کہ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا اور میں نے سوچا کہ یہ پچھلی بہار یا اس سے بھی پچھلی بہار کا محبوب ہے، جب میں نہ تھا۔ اور پھر شاید اور آگے بھی کتنی ہی ایسی بہاریں آئیں گی کتنی ہی پورے چاند کی راتیں جب محبت ایک فاحشہ عورت کی طرح بے قابو ہو جائے گی اور عریاں ہو کے رقص کرنے لگے گی۔ آج تیرے گھر میں خزاں آ گئی ہے جیسے ہر بہار کے بعد آتی ہے۔ اب تیرا یہاں کیا کام اس لیے میں یہ سوچ کر ان سے ملے بغیر اسی طرح واپس چلا گیا اور پھر اپنی پہلی بہار سے کبھی نہیں ملا۔

اور اب میں اڑتالیس برس کے بعد لوٹ کے آیا ہوں، میرے بیٹے میرے ساتھ ہیں۔ میری بیوی مر چکی ہے لیکن میرے بیٹوں کی بیویاں اور ان کے بچے میرے ساتھ ہیں اور ہم لوگ سیر کرتے کرتے سمل جھیل کے کنارے آ نکلے ہیں اور اپریل کا مہینہ ہے سہ پہر سے شام ہو گئی ہے اور میں دیر تک پل کے کنارے بادام کے پیڑوں کی قطاریں دیکھتا جاتا ہوں اور خنک ہوا میں سفید شگوفوں کے گچھے لہراتے جاتے ہیں اور پگڈنڈی کی خاک پر سے کسی جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک حسین

دوشیزہ لڑکی ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دبائے پل پر سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے اور میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ دور پار تنکوں سے پرے بستی میں کوئی بیوی اپنے خاوند کو آواز دے رہی ہے، وہ اسے کھانے پر بلا رہی ہے۔ کہیں سے ایک دروازہ بند ہونے کی صدا آتی ہے اور ایک روتا ہوا بچہ یکا یک چپ ہو جاتا ہے چھتوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پرندے شور مچاتے ہوئے ایک دم درختوں کی گھنی شاخوں میں اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور پھر ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ ضرور کوئی مانجھی گا رہا ہے اور اس کی آواز گونجتی گونجتی افق کے اس پار گم ہوتی جا رہی ہے۔ میں پل کو پار کر کے آگے بڑھتا ہوں میرے بیٹے اور ان کی بیویاں اور بچے میرے پیچھے آ رہے ہیں، الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہاں پر بادام کے پیڑوں کی قطار ختم ہو گئی تلہ بھی ختم ہو گیا۔ جھیل کا کنارہ ہے۔ یہ خوبانی کا درخت ہے، لیکن کتنا بڑا ہو گیا ہے، مگر کشتی، یہ کشتی ہے مگر کیا یہ وہی کشتی ہے۔ سامنے وہ گھر ہے میری پہلی بہار کا گھر، میری پورے چاند کی رات کی محبت۔

گھر میں روشنی ہے بچوں کی صدائیں ہیں۔ کوئی بھاری آواز میں گانے لگتا ہے۔ کوئی بڑھیا اسے چیخ کر چپ کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، آدھی صدی ہو گئی میں نے اس گھر کو نہیں دیکھا۔ دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ میں گھر کے اندر چلا جاتا ہوں۔

بڑے اچھے پیارے بچے ہیں۔ ایک جوان عورت اپنے خاوند کے لیے رکابی میں کھانا رکھ رہی ہے، مجھے دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔ دو بچے لڑ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے چپ ہو جاتے ہیں۔ بڑھیا جو

ابھی غصے میں ڈانٹ رہی تھی، تھم کے پاس آ کے کھڑی ہو جاتی ہے، کہتی ہے: ''کون ہو تم؟''

میں نے کہا: یہ میرا گھر ہے''

یہ وہ بولی: ''تمھارے باپ کا ہے''

میں نے کہا: ''میرے باپ کا نہیں ہے میرا ہے۔ کوئی اڑتالیس برس ہوئے، میں نے اسے خریدا تھا۔ بس اس وقت تو یونہی میں اسے دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ آپ لوگوں کو نکالنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ یہ گھر تو بس سمجھیے اب آپ ہی کا ہے۔ میں تو یونہی... میں یہ کہہ کر لوٹنے لگا۔ بڑھیا کی انگلیاں سختی سے تھم پر جم گئیں۔ اس نے سانس زور سے اندر کو کھینچی۔ بولی: ''تو تم ہو... اب اتنے برس کے بعد کوئی کیسے پہچانے......''

وہ تھم سے لگی دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نیچے آنگن میں چپ چاپ کھڑا اس کی طرف تکتا رہا پھر وہ آپ ہی آپ ہنس دی بولی،: ''آؤ میں تمھیں اپنے گھر کے لوگوں سے ملاؤں ......دیکھو یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ اس سے چھوٹا ہے، یہ بڑے بیٹے کی بیوی ہے۔ یہ میرا بڑا پوتا ہے سلام کرو بیٹا۔ یہ پوتی...... یہ میرا خاوند ہے شش! اسے جگاؤ نہیں۔ پرسوں سے اسے بخار آ رہا ہے، سونے دو اسے......''

وہ بولی: ''تمہاری کیا خاطر کروں''

میں نے دیوار پر کھونٹی سے ٹنگے ہوئے مکئی کے بھٹوں کو دیکھا۔ بھٹے سنہرے موتیوں کے سے شفاف دانے۔

ہم دونوں مسکرا دیے۔

وہ بولی: ''میرے تو بہت سے دانت جھڑ چکے ہیں، جو ہیں وہ کام نہیں کرتے''

میں نے کہا: ''یہی حال میرا بھی ہے۔ بھٹا نہ کھا سکوں گا۔''

مجھے گھر کے اندر گھستے دیکھ کر میرے گھر کے افراد بھی اندر چلے آئے تھے اب خوب گہما گہمی تھی۔ بچے ایک دوسرے سے بہت جلد گھل مل گئے۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر چلے آئے۔ آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے چلے گئے۔

وہ بولی: ''میں نے چھے برس تمھارا انتظار کیا تم اس روز کیوں نہیں آئے؟''

میں نے کہا: ''میں آیا تھا۔ مگر تمھیں کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا''

''کیا کہتے ہو؟ وہ بولی''

''ہاں تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں، ایک ہی رکابی میں اور وہ تمہارے منہ میں اور تم اس کے منہ میں لقمے ڈال رہی تھیں۔''

وہ اک دم چپ ہو گئی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ بولی: ''ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا۔''

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی ''وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اسی روز تم بھی آنے والے تھے۔ وہ

واپس جارہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا کہ تم سے مل کے جائے تم پھر آئے ہی نہیں‘‘

وہ اک دم سنجیدہ ہوگئی۔ چھے برس میں نے تمھارا انتظار کیا تمھارے جانے کے بعد مجھے خدا نے بیٹا دیا تمہارا بیٹا۔ مگر ایک سال بعد وہ بھی مر گیا۔ چار سال اور میں نے تمھاری راہ دیکھی مگر تم نہیں آئے پھر میں نے شادی کرلی۔

دو بچے باہر نکل آئے کھیلتے کھیلتے ایک بچہ دوسری بچی کو مکئی کا بھٹا کھلا رہا تھا۔

اس نے کہا: ’’وہ میرا پوتا ہے۔‘‘

میں نے کہا: ’’وہ میری پوتی ہے۔‘‘

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے جھیل کے کنارے کنارے دور تک چلے گئے۔ زندگی کے دو خوبصورت مرقعے۔ ہم دیر تک انھیں دیکھتے رہے۔ وہ میرے قریب آگئی۔ بولی: ’’آج تم آئے ہو تو مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے اب اپنی زندگی بنالی ہے۔ اس کی ساری خوشیاں اور غم دیکھے ہیں۔ میرا ہرا بھرا گھر ہے۔ اور آج تم بھی آئے ہو مجھے ذرا بھی برا نہیں لگ رہا ہے‘‘

میں نے کہا: ’’یہی حال میرا ہے۔ سوچتا تھا زندگی بھر تم سے نہیں ملوں گا۔ اسی لیے اتنے برس ادھر بھی نہیں آیا۔ اب آیا ہوں تو رتی بھر بھی برا نہیں لگ رہا۔‘‘

ہم دونوں چپ ہوگئے۔ بچے کھیلتے کھیلتے ہمارے پاس واپس آگئے اس نے میری پوتی کو اٹھالیا، میں نے اس کے پوتے کو، اس نے میری پوتی کو چوما، میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے

ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت سے اور مسرت سے کہہ رہا تھا: ''انسان مر جاتے ہیں، لیکن زندگی نہیں مرتی بہار ختم ہو جاتی ہے۔لیکن پھر دوسری بہار آ جاتی ہے چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں لیکن زندگی کی بڑی عظیم سچی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے۔ یہ بہار تم نے دیکھیں، اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہو گے، لیکن زندگی بھی ہوگی اور محبت بھی ہوگی اور خوبصورتی اور رعنائی اور معصومیت بھی......

بچے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ سے کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت کے قریب چلے گئے، جہاں کشتی بندھی تھی۔ میں نے پوچھا: ''یہ وہی درخت ہے۔''

اس نے مسکرا کر کہا: ''نہیں یہ دوسرا درخت ہے۔''

معنی اور اشارے:

خنکی	=	ٹھنڈک
لطافت	=	نرمی، وہ کیفیت جو نہ بہت تیز ہو اور نہ گھٹل
تنگ	=	پہاڑ کی چوٹی، اونچائی
دوب	=	ہلکے رنگ کی گھاس
گوت	=	خاندان
بے لوث	=	بے غرض
زمستاں	=	جاڑا
شکارا	=	ایک قسم کی کشتی جو صرف کشمیر میں استعمال ہوتی ہے۔
رقصاں	=	ناچتا ہوا
لرزاں	=	کانپتا ہوا
سنگلاخی	=	پتھریلی
گوڑی کرنا	=	کھرپی سے پودوں کے آس پاس کی مٹی کو نیچے اوپر کرنا، گوڑنا
نلائی	=	کھیت میں سے گھاس کوڑا صاف کرنا
افق	=	جہاں آسمان اور زمین ملتے دکھائی دیتے ہیں
قرمزی	=	لال

لمس = چھونا

شگوفہ = کلی

جرد آلو = (زرد آلو) ایک قسم کا پہاڑی پھل، اسے عام طور پر خوبانی کی ایک قسم کہتے ہیں

خوبانی = ایک میوے کا نام جو بھورے رنگ کا ہوتا ہے اور مزے میں میٹھا ہوتا ہے

سمفنی (Symphony) = مختلف سازوں کے ذریعے ترتیب دی ہوئی موسیقی

مات کرنا = شکست دینا

صبیح = سفید رنگت والا، خوبصورت، گورا

کھلیان = اناج کا ڈھیر

عریاں = ننگا

کثیرالجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) کرشن چندر کا اصل تعلق کہاں سے تھا؟

(a) لاہور **(b)** دہلی

(c) کشمیر **(d)** پنجاب

(2) کرشن چندر کی وفات کب ہوئی؟

(a) 1975ء **(b)** 1977ء

(c) 1970ء **(d)** 1980ء

(3) پورے چاند کی رات کس کی تخلیق ہے؟

(a) کرشن چندر (b) پریم چند

(c) بیدی (d) منٹو

(4) حکومت ہند کی جانب سے کرشن چندر کو پدم پھوشن کا اعزاز کب ملا؟

(a) 1965ء (b) 1962ء

(c) 1969ء (d) 1975ء

(5) تسلم خیال کس کا افسانوی مجموعہ ہے؟

(a) پریم چند (b) بیدی

(c) کرشن چندر (d) سدرشن

مختصر ترین سوالات (Very short questions) :

(1) کرشن چندر کے کسی تین ناولوں کے نام لکھیے؟

(2) کرشن چندر کے تین افسانوی مجموعوں کے نام لکھیے؟

(3) کہانی بیان کرنے والے کی لڑکی سے ملاقات کس مہینے میں ہوئی؟

(4) کہانی بیان کرنے والے کی لڑکی سے ملاقات کہاں پر ہوئی تھی؟

مختصر سوالات (Short questions) :

(1) لڑکی اس کے لئے کیا تحفے لائی تھی؟

(2) کہانی بیان کرنے والے نے اپنی محبوبہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھا تو اس کا کیا ردعمل رہا؟

(3) کہانی بیان کرنے والے جب اپنے خاندان کے ہمراہ کشمیر گیا تو اس کی ملاقات کن لوگوں سے ہوئی؟

(4) لڑکی کہانی بیان کرنے والے شخص سے ملاقات کے لئے کیا بہانے بنا کر آئی تھی؟

تفصیلی سوالات (Long questions) :

(1) کہانی کی منظر نگاری کے بارے میں ایک پیراگراف لکھیے؟

(2) کرشن چندر کے اسلوب تحریر کے بارے میں مختصراً اظہار خیال کیجیے؟

(3) کرشن چندر کے افسانوں کے موضوعات کیا ہیں؟

سبق (5) راجندر سنگھ بیدی

مختصر سوانح

(1) نام : راجندر سنگھ بیدی

(2) ولادت : 1915ء سیالکوٹ

(3) وفات : 1984ء بمبئی

(4) مشہور تصانیف: کوکھ جلی، مکّی بودھ، گرہن، ایک چادر میلی سی۔

(5) اعزازات : پدم شری، مرزا غالب اوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ۔

اردو افسانے کی روایت میں راجندر سنگھ بیدی ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بیدی ۱ر ستمبر 1915ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام بابا ہیرا سنگھ اور والدہ سیوا دیوی برہمن خاندان سے تھیں۔ انٹر میڈیٹ تک پہنچے تھے کہ والدہ تپ دق کی بیماری سے انتقال کر گئیں۔ ماں کے مرنے کے چار پانچ سال بعد والد بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز بھی کالج کی زندگی یعنی 1931ء سے تقریباً سترہ اٹھارہ سال کی عمر

سے ہوتا ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے انگیریزی میں نظمیں لکھیں اور اردو و پنجابی میں افسانے اور مضامین لکھے۔ **1935**ء میں بیدی کو پوسٹ آفس میں کلرک کی نوکری ملی۔ اس دوران بیدی نے بلا معاوضہ رسالہ ''سارنگ'' ایڈٹنگ کا کام سنبھالا۔ **1943**ء میں ڈاک خانے کی ملازمت سے مستعفی ہوکر آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت اسٹاف آرٹسٹ کام کرنے لگے۔ ریڈیو اسٹیشن جموں میں ڈائرکٹر مقرر ہوئے لیکن ایک ہی سال میں استعفیٰ دیا اور بمبئ چلے گئے۔ وہیں **1984**ء میں وفات ہوئی۔

بیدی کے افسانوں کے کل چھ مجموعے شائع ہوئے۔

ا۔ دانہ ودام **1936**ء ۲۔ گرہن **1942**ء ۳۔ کوکھ جلی **1949**ء ۴۔ اپنے دکھ مجھے دے دو **1965**ء ۵۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے **1974**ء ۶۔ مکتی بودھ **1982**ء

ان کے علاوہ ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہوئے۔

ا۔ بے جان چیزیں **1943**ء ۲۔ سات کھیل **1974**ء

راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' **1962**ء ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ بیدی نے فلمیں بھی بنائیں۔ جن میں ''دستک'' خاصی مشہور ہوئی۔

بیدی کو غم زدہ دل، انسانی قدروں کی پہچان اور قوت متخیلہ بہت حد تک وراثت میں ملی۔ بیدی کے افسانے پڑھنے سے زیادہ محسوس کرنے کے لیے ہیں۔ پنجاب کی زندگی کی جتنی سچی تصویر کشی بیدی نے کی

ہے وہ شاید ہی کوئی کر سکا۔ بیدی کے افسانے پنجاب کے گلی کوچوں، دیہاتوں، کھیتوں، میدانوں، میں سانس لیتے ہیں۔ بیدی بہت کم اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت کچھ کہتے ہیں۔اپنے اردگرد کی سبھی چیزوں کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کرتے ہیں۔ بیدی اپنے افسانوں کے کرداراس طرح تراشتے ہیں جیسے کوئی سنگ تراش پتھر کے ٹکڑے کوتراش کرزندہ اورروشن وجود میں بدل دیتا ہے۔

گرم کوٹ بیدی کا لازوال افسانہ ہے۔کلرک کا بوسیدہ کوٹ اس کی بدحال زندگی کی داستان ہے۔

گرم کوٹ

میں نے دیکھا ہے۔ معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دوکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بالکل پھٹ گیا ہے، اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ ضرور سلوا لینا چاہیے۔ ٹیلر ماسٹر کی دوکان کے سامنے سے گزرنے یا اپنے محکمے کے تفریح کلب میں جانے سے گریز کروں تو ممکن ہے مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے کیونکہ کلب میں جب سنتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ (**Worsted**) میرے سمندِ تخیل پہ تازیانہ لگاتے ہیں تو میں اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگتا ہوں، یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لیے مجھ سے معمولی کلرک کو اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنا پڑتی ہیں، اور انھیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لیے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے............ یہ گرم کوٹ میں نے پارسال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔

کوٹوں کے سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سیکڑوں گانٹھیں کسی مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے مرانجا، مرانجا اینڈ کو کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مگر کوٹ مجھے ملا بہت سستا۔ مہنگا روئے ایک بار، سستا روئے بار بار۔ اور میرا کوٹ ہمیشہ

ہی پھٹا رہتا تھا۔

اس دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آتے ہوئے میں ارادتاً انارکلی میں سے گزرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا، دال، ایندھن بجلی بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا....... جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گزرنا معیوب نہیں۔ اس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آ رہے تھے اور ساڑھیاں۔ چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے۔ میں نے سنا ہے گزشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید اسی لیے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ نئے نئے سوٹ پہننا اور خوب شان سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔ ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں ایسی شان وشوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے، انھیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا: کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا ردعمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا بٹن پکڑ کر اسے بل دینے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آ گئی تھی، اس لیے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپنا وہ کوٹ بھی سراسر تکلّف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں، وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتے۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیص بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیے تو کیا میں سچ مچ امیر تھا؟ میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بہ مشکل دس کا نوٹ صحیح سلامت لیے گھر پہنچا۔ شمی میری بیوی

میری منتظر تھی۔ آٹا گوندھتے ہوئے اس نے آگ پھونکنی شروع کر دی۔ کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیوں میں سے زیادہ دھواں اٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارا ہوگئیں، ان سے پانی بہنے لگا۔ ''کم بخت کہیں کا۔ منگل سنگھ'' میں نے کہا ''ان پرنم آنکھوں کے لیے منگل سنگھ تو کیا میں تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں''۔

بہت تگ و دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چٹخنے لگیں۔ آخر ان پرنم آنکھوں کے پانی نے میرے غصے کی آگ بجھا دی۔۔۔ شمی نے میرے شانے پر سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں پتلی پتلی انگلیاں داخل کرتی ہوئی بولی: ''اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔ میں نے دھیمی آواز سے کہا ''ہاں!'' ''سی دوں؟ یہاں سے........''

''سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہنے ہیں۔''

کوٹ کو اُلاٹتے ہوئے شمی بولی: ''استر کو تو موئی ٹڈیاں چاٹ رہی ہیں، نقلی ریشم کا ہے نا۔ یہ دیکھیے۔''

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا اور کہا: ''مشین کے پاس بیٹھنے کے بجائے تم میرے پاس بیٹھو شمی۔ دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آ رہا ہوں........ یہ کام تم اس وقت کر لینا جب میں سو جاؤں''

شمی مسکرانے لگی۔

وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ اسے مرمت کرنے میں اس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے، آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔ آخر آپ اپنے کوٹ کے لیے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟''

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لیے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرتا تھا مگر شمی کی آنکھیں ۔ اُن آنکھوں کو تکلیف سے بچانے کے لیے میں منگل سنگھ تو کیا تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں، ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خرید لوں۔ نئے گرم کوٹ کے لیے کپڑا خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا کہ پشپامنی بھاگتی ہوئی کہیں سے آ گئی۔ آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اس کی حرکات کتھا کلی مدرا سے زیادہ کیف انگیز تھیں۔

مجھے دیکھتے ہوئے پشپامنی نے اپنا ناچ اور گانا ختم کر دیا۔ بولی: ''بابو جی_____ آپ آگئے_____ آج بڑی بہن جی (استانی) نے کہا تھا'' میز پوش کے لیے دوسوتی لانا۔ گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی ۔گنیا ناپ کے لیے اور گرم کپڑا۔''

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی ، شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگائی اور بولی : اس جنم جلی کو ہر وقت ...... ہر وقت کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے۔ مشکل سے انھیں کوٹ سلوانے پر راضی کر رہی ہوں۔''

وہ پشپامنی کا رونا اور میرا نیا کوٹ ۔ میں نے خلاف عادت اونچی آواز سے کہا: شمی!''

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا: ''میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو ...ابھی کسی طرح کرو...ایسے جیسے رو پیٹ کر منگل سنگھ کی گیلی لکڑیاں جلا لیتی ہو...تمھاری آنکھیں! ہاں! یاد آیا دیکھو تو پشپامنی کیسے رو رہی ہے۔ پوپی بٹیا! ادھر آؤ نا۔ ادھر آؤ میری بچی! کیا کہا تھا تم نے؟ بولو تو_ دوسوتی؟ گُنیا ناپ کے لیے اور کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا؟__ بچّو ننھا بھی تو ٹرائسکل کا راگ الاپتا اور غبارے کے لیے مچلتا سو گیا ہوگا۔ اسے غبارا نہ لے دو گی تو میرا کوٹ سل جائے گا۔ ہے نا_____؟ کتنا رویا ہوگا بے چارہ.....شمی!

کہاں ہے بچو؟ بچو آ گئے آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

میں نے شمی کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ یوں ہی کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے سب سے پہلے لکھے۔ اچانک رسوئی کی طرف میری نظر اٹھی چولھے میں لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں معلوم ہوا کہ منگل سنگ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے۔

''وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں اور کھوکھا____''شمی نے کہا۔

''اور اُپلے؟''

''جی ہاں، اپلے بھی۔''

''منگل سنگھ دیوتا ہے____شاید میں بھی جلدی ہی گرم کوٹ کے لیے اچھا سا ورسٹڈ خرید لوں تاکہ تمھاری آنکھیں یوں ہی چمکتی رہیں، انھیں تکلیف نہ ہو_____اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں۔ اگلے مہینے ضرور____ضرور____''

''جی ہاں جب سردی گزر جائے گی''....

پشپا منی نے کئی چیزیں لکھوائیں۔ دوسوتی، گنیا ناپ کے لیے گرم بلیز ر سبز رنگ کا ایک گز مربع، ڈی۔ایم۔سی۔ کے گولے، گوٹے کی مغزی اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن...موئی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا۔ مجھے دائمی قبض تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یونانی دوا خانے سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبہ بھی لا رکھوں۔ دودھ کے ساتھ تھوڑا سا کھا کر سو جایا کروں گا مگر موئی پشپا نے اس کے لیے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی، اور جب پشپا منی نے کہا'' گلاب جامن'' تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو یہی ہے____شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دوں گا، جہاں سیڑھیوں

میں باہر جمعدار اپنا دودھ کا کلسار کھ دیا کرتا ہے اور پشپا سے کہوں گا کہ میں تو لانا ہی بھول گیا تمھارے لیے گلاب جامن ____ اوہو! ____ اس وقت اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا اور گلاب جامن نہ پا کر اس کی عجیب کیفیت ہوگی۔

پھر میں نے سوچا بچو بھی تو صبح سے غبارے اور ٹرائسکل کے لیے ضد کر رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا "اطریفل زمانی؟" شمی بچو کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی: "بچو بیٹی کو ٹرائسکل لے دوں گی اگلے مہینے... بچو بیٹی سارا دن چلایا کرے گی ٹرائسکل ___ پو پی منّا کچھ نہیں لے گا ____"

بچو چلایا کرے گی..... اور پو پی منا کچھ نہیں لے گا!"

اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی کہ جب تک ٹرائسکل کے لیے چھ سات روپے جیب میں نہ ہوں میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گزروں گا، اس لیے کہ دام نہ ہونے کی صورت میں نیلے گنبد کے بازار سے گزرنا بہت معیوب ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پر غصہ آئے گا، اپنی ذات سے نفرت پیدا ہوگی۔

اس وقت شمی بلجیمی آئینے کی بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپید سوٹ میں کھڑی تھی۔ میں چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میں بتاؤں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟"

"بتاؤ تو جانوں"

"تم کہہ رہی ہو کافوری سپید سوٹ کے ساتھ وہ کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے پہن کر ضلع دار کی بیوی کے ہاں جاؤ تو دنگ رہ جائے گی..."

"نہیں تو" شمی نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ میری آنکھوں سے پیار کرتے تو کبھی کا گرم..."

میں نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا میری تمام خوشی بے بسی میں بدل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا: "بس..... ادھر دیکھو..... اگلے مہینے..... ضرور خرید لوں گا"۔

''جی ہاں، جب سردی.....''

پھر میں اپنی اس حسین دنیا کو، جس کی تخلیق پر محض دس روپے صرف ہونے تھے، تصور میں بسائے بازار چلا گیا۔

میرے سوا انارکلی سے گزرنے والے ہر ذی عزت آدمی نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ لاہور کے ایک کیم شحیم جنٹلمین کی گردن نکٹائی اور مکلّف کالر کے سبب میرے چھوٹے بھائی کے پالتو کتے ''ٹائیگر'' کی گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''لوگ سچ مچ مفلس ہو گئے ہیں ____ اس مہینے نہ معلوم کتنا سونا چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔'' کانٹوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کانٹے دیکھے۔ اپنے تخیل کی پختہ کاری سے میں شمی کی کا فوری سپید سوٹ میں ملبوس ذہنی تصویر کو کانٹے پہنا کر پسند یا ناپسند کر لیتا ____ کافوری سپید سوٹ ____ کافوری مینا کار کانٹے ____ کثرت اقسام کے باعث ایک بھی منتخب نہ کر سکا۔

اس وقت بازار میں مجھے یزدانی مل گیا۔ وہ تفریح کلب سے جو دراصل پریل کلب تھا، پندرہ روپے جیت کر آیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر اگر سرخی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں تو کچھ تعجب کی بات نہ تھیں۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔ نچلی بائیں جیب پر ایک روپے کے برابر کوٹ سے ملتے ہوئے رنگ کا پیوند بہت ہی ناموزوں دکھائی دے رہا تھا ____ میں اسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا: کیا عجب یزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے میری جیب کی سلوٹیں اور وہ روپے کے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو ____ اس کا بھی ردِعمل شروع ہوا اور میں نے دلیری سے کہا:

مجھے کیا پروا ہے ____ یزدانی مجھے کون سی تھیلی بخش دے گا ____ اور اس میں بات ہی کیا ہے۔

یزدانی اور سنتا سنگھ نے بار ہا مجھ سے کہا ہے کہ وہ رفعت ذہنی کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور ورسٹڈ کی کم۔

مجھ سے کوئی پوچھے میں ورسٹڈ کی زیادہ پروا کرتا ہوں اور رفعت ذہنی کی کم!

یزدانی رخصت ہوا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں غور سے اس کے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشپا منی کے لیے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنی چاہیے۔ کہیں واپسی پر سچ مچ بھول ہی نہ جاؤں۔ گھر پہنچ کر انھیں چھپانے سے خوب تماشا رہے گا۔ مٹھائی کی دوکان پر کھولتے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس طرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پشپا منی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ قبض اور اطریفل زمانی کے خیال کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا۔

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لیے جیب ٹٹولی تو اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا۔

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سوراخ ہو رہا تھا۔ نقلی ریشم کو ٹڈیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس جگہ مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کا لیبل لگا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ باہر نکل آیا۔ نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہوگا۔

ایک لمحے میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوب صورت، ملائم سی اون اتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔ حلوائی بھانپ گیا، خود ہی بولا:

”کوئی بات نہیں بابو جی... پیسے کل آجائیں گے“

میں کچھ نہ بولا..... کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہار تشکر کے لیے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دھوئیں میں سے آتشیں سرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں.....اور ذہن میں پشیمانی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔

میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹے کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصے میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ کرتا ہوا انجن جس میں سے دہکتے ہوئے سرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے_____ مگر اس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اور ٹائم لگا کر لوٹ رہے تھے_____ میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

''قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے'' میں نے کہا۔ ''پشپامنی کے لیے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن اور شمی کے لیے کافوری مینا کار کانٹے خریدنے سے بڑھ کر کوئی گناہ سرزد ہوسکتا ہے؟ کس بے رحمی اور بے دردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کر دی گئی ہے_____ جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک ''شاہکار'' توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔''

مگر پانی میں کشتی راں لڑکا کہہ رہا تھا۔

''اس موسم میں تو راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا۔''

''سارا پانی تو اوپر سے اوپر باری دواب لے لیتی ہے_____ اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی_____'' دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔

میری خواہش اور اندازے کے مطابق پشپامنی اور بچّو نھا بہت دیر ہوئی دہلیز سے اٹھ کر بستروں میں جاسوئے تھے۔شمی چولھے کے پاس شہتوت کے نیم جان کوئلوں کو تاپتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔اس کے سامنے میں نے چور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیبل کے نیچے سے نکال لیا۔شمی سب کچھ سمجھ گئی۔وہ کچھ نہ بولی____ کچھ بول ہی نہ سکی۔

میں نے کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا۔میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لے کر شمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سوئے ہوئے بچوں اور کھونٹی پر لٹکے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کیے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو شاید میری حالت اتنی مُتغیّر نہ ہوتی۔

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پریل کھیل رہے تھے۔انھوں نے دو دو گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لیے اصرار کرنے لگے مگر میں نے انکار کر دیا۔اس لیے کہ میری جیب میں دام نہ تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے پلا دیا۔شاید اس لیے کہ وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔یا شاید اس لیے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پروا کرتے تھے۔

اگر میں گھر میں اس دن شمی کو وہی کافوری سپید سوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر نہ آتا تو شاید پریل میں قسمت آزمائی کرنے کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا: کاش! میری جیب میں بھی ایک دو روپے ہوتے۔ کیا عجب تھا کہ میں بہت سے روپے بنا لیتا، مگر میری جیب میں تو کل پونے چار آنے تھے۔

یزدانی اور سنتا سنگھ نہایت عمدہ ورسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم، کلب کے سکریٹری سے جھگڑ رہے تھے۔ نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ تفریح کلب کو پریل کلب اور بار بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔اس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا: ''بیوی بچوں کے لیے کچھ خرید

ناقدرت کے نزدیک گناہ ہے۔ اس حساب سے تو پریل کھیلنے کے لیے تو اسے اپنی گرہ سے دام دینے چاہیے۔ہی ہی...غی غی____''

اندرونی کیسہ____باتیں نچلی جیب____ کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہوا معلوم ہوا۔ اسے سرکاتے ہوئے ____میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

وہ دس روپے کا نوٹ تھا جو اس دن اندرونی جیب کی تہ کے سوراخ میں سے گزر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا۔

اس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اس کی خواہش کے مطابق پریل دریل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اس دن میرا انتظار کیے بغیر شمی نے وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور، گویا ایک حسین سے حسین دنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی۔ جب میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا، شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کر دیا اور بولی:

''اتنے قلعے مت بنایے........پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی۔''

''شمی ٹھیک کہتی ہے،'' میں نے سوچتے ہوئے کہا ''نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے''

پھر میں نے کہا: '' ایک بات ہے شمی ! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے______ تمھاری کھیمو پڑوسن باہر جا رہی ہے اس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ ____ کافوری مینا کار کانٹے____ ڈی.ایم.سی. کے گولے، مغزی اور دیکھو پوپی مُنا کے لیے گلاب جامن ضرور لانا____ضرور''

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کر لیا اور اس شام شمی نے کشمیرے کا ایک وہ سوٹ پہنا جو اسے جہیز میں ماں باپ نے دیا تھا۔

بچوں کے شور وغوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے مگر اس دن میں دیر تک بچّو ننّھے کو اس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوئی سے ایندھن کی کوٹھی، غسل خانے، چھت پر ____ سب جگہ اسے ڈھونڈتا پھرا۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا:

وہ ٹرائسکل لینے گئی ہے ____ نہیں جانے دو، ٹرائسکل گندی چیز ہوتی ہے، اخ تھو ____ غبارا لائے گی بی بی تمھارے لیے، بہت خوبصورت غبارا ____''

بچّو بیٹی نے میرے سامنے تھوک دیا، بولی: ''اے ____ گندی ____''

میں نے کہا ''کوئی دیکھے تو ____ کیسا بیٹیوں جیسا بیٹا ہے''

پشپا منی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا: ''پوپی مُنّا ____ آج گلاب جامن جی بھر کے کھائے گا نا! ____''

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گود سے اتر پڑی اور بولی: ''ایسا معلوم ہوتا ہے ____ جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں''

بچو روتا رہا۔ پشپا منی کتھا کلی مدرا سے زیادہ حسین ناچ برآمدے میں ناچتی رہی۔

مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا۔ کہیں میرے تخیل کے قلعے زمین پر نہ آرہیں، اسی ڈر سے تو میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سوچ رہا تھا شمی اب گھوڑے اسپتال کے قریب پہنچ چکی ہوگی ____ اب کالج روڈ کے نکڑ پر ہوگی ____ اب گندے انجن کے پاس ____۔

اور ایک نہایت دھیمی آواز سے زنجیر ہلی۔

شمی سچ مچ آ گئی تھی دروازے پر۔

شمی اندر آتے ہوئے بولی: ''میں نے دو روپے کھیمو سے ادھار لے کر بھی خرچ کر ڈالے ہیں''

''کوئی بات نہیں'' میں نے کہا۔

پھر بچو، پوپی منا اور میں، تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس نے میز پر بنڈل کھولا۔

وہ میرے کوٹ کے لیے بہت نفیس ورسٹڈ تھا۔

پشپامنی نے کہا: ''بی بی، میرے گلاب جامن....''

شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی۔

معنی اوراشارے:

آویزاں = لٹکا ہوا معلق

ہاتھ تنگ ہونا = تنگ دست ہونا، کنگال ہونا

محکمہ = حکم کرنے کی جگہ، ڈپارٹمنٹ

گریز کرنا = دور رہنا

تفریح = دل لگی، فرحت، سیر

نفیس = عمدہ، قیمتی، پاکیزہ

ورسٹڈ = انگیریزی میں **Worsted** ایک کپڑا جو چکنے لمبے اون سے بنا جاتا ہے۔

تخیل = قوت متخیلہ، تصور، خیال

سمند تخیل پر تازیانہ لگانا = خیالات کے گھوڑے کو کوڑا لگانا، یعنی نئے نئے اور دور دور کے خیال پیدا کرنا

بوسیدہ = پرانا

ترک کرنا = چھوڑ دینا

پارسال = گزشتہ سال

ارادتاً = ارادہ کر کے، جان بوجھ کر

معیوب = عیب دار، قابل شرم

نتھو خیرا = ادنیٰ حیثیت والا، معمولی آدمی۔

بدیہی = وہ بات جس میں دلیل کی حاجت نہ ہو

چنداں	=	اس قدر
زیبائش	=	آرائش، زینت، سجاوٹ
افلاس	=	مفلسی، تنگ دستی، غریبی
ردعمل	=	جوابی عمل
بل دینا	=	مروڑنا
خارجی	=	بیرونی، باہر کا
قاصر	=	مجبور، ناچار
منتظر	=	انتظار کرنے والا
تگ ودو	=	دوڑ دھوپ
تکلف	=	بناوٹ
شانہ	=	کندھا
کتھاکلی	=	ناچ کی ایک قسم
مُدرا	=	اشارہ، علامت، نشان
کیف انگیز	=	لذت پیدا کرنے والا
گنیا	=	ایک آلہ جس سے فاصلہ ناپا جاتا ہے۔
کافوری رنگ	=	بالکل سفید رنگ
بلیزر	=	ایک طرح کا اونی کپڑا
دائمی	=	ہمیشہ رہنے والا

گوٹے کی مغزی	=	گوٹے کے دونوں طرف لگائے جانے والا کنارہ
کلسہ	=	برتن، پیتل کا تنگ منہ کا بڑا گھڑا
پچکارنا	=	لاڈ سے باتیں کرنا
بیضوی	=	انڈے کی شکل کا
تخلیق	=	پیدا کرنا
ذی عزت	=	عزت والا
لحیم شحیم	=	موٹا تازہ
کوٹھی	=	ایندھن رکھنے کی جگہ
اپر باری	=	دوآب پنجاب کی ایک نہر
مکلّف	=	کلف دیا ہوا
پختہ کاری	=	پختگی
اقسام	=	قسم کی جمع
بشاشت	=	تازگی
رفعت ذہنی	=	خیال کی بلندی
پشت	=	پیٹھ
کیسہ	=	جیب
پرواز	=	اڑان
متغیر نہ ہوئی	=	نہ بدلی

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) راجندر سنگھ بیدی کی پیدائش کہاں ہوئی ؟

(a) لکھنؤ (b) سیالکوٹ

(c) کانپور (d) دہلی

(2) بیدی کے افسانوں کے کل کتنے مجموعے شائع ہوئے ؟

(a) چھ (b) ایک

(c) چار (d) تین

(3) ''دانہ و دام'' اور ''گرہن'' کس کے افسانوی مجموعے ہیں ؟

(a) کرشن چندر (b) بیدی

(c) پریم چند (d) منٹو

(4) ''ایک چادر میلی سی'' کا سنہ تصنیف لکھیے ؟

(a) 1965ء (b) 1962ء

(c) 1969ء (d) 1963ء

(5) شمی کس افسانے کا کردار ہے ؟

(a) گرم کوٹ (b) کفن

(c) پورے چاند کی رات (d) عبرت

(6) بیدی کا انتقال کب ہوا؟

(a) 1980ء　　(b) 1979ء

(c) 1984ء　　(d) 1990ء

(7) پنجاب کے دیہات کی سماجی عکاسی کس افسانہ نگار نے کی؟

(a) پریم چند　　(b) راجندر سنگھ بیدی

(c) حیات اللہ انصاری　　(d) قاضی عبدالستار

(8) کون سا افسانوی مجموعہ راجندر سنگھ بیدی کا نہیں ہے؟

(a) گرہن　　(b) کوکھ جلی

(c) دو ہاتھ　　(d) دانہ و دام

مختصر ترین سوالات (Very short questions) :

(1) گرم کوٹ کس کا افسانہ ہے؟

(2) مہنگا روئے ایک بار، سستا روئے بار بار۔ معنی واضح کریں۔

(3) افسانہ گرم کوٹ کے دو کرداروں کے نام لکھیے؟

مختصر سوالات (Short questions) :

(1) افسانہ نگاری پر مختصر نوٹ لکھیے؟

(2) افسانہ گرم کوٹ کا مرکزی خیال واضح کیجیے؟

تفصیلی سوالات (Long questions) :

(1) مندرجہ ذیل کا مطلب اپنی آسان زبان میں سیاق وسباق کے ساتھ لکھیے :

’’قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے‘‘ میں نے کہا ’’پشپا منی کے لیے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن، اور شمی کے لیے کافوری مینا کار کانٹے خریدنے سے بڑھ کر کوئی گناہ سر زد ہوسکتا ہے؟ کس بے رحمی اور بے دردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کر دی گئی ہے.....جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک ’’شاہکار‘‘ توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔‘‘

خاکہ

خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے جس نے بہت مختصر عرصے میں ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ انگریزی میں خاکہ نگاری کے لیے **Pen Portrait** یا **Sketch** کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں اس کو ریکھا چتر (रेखा चित्र) کہا جاتا ہے۔

خاکہ میں شخصیت کے مثبت و منفی پہلوؤں کی آمیزش سے ایسی جیتی جاگتی تصویر بنائی جاتی ہے کہ اس میں اختصار کا خاص خیال رکھا جائے۔ خاکہ میں کسی شخصیت کے ان مخصوص واقعات کو پیش کیا جاتا ہے جن کے پڑھنے سے اس شخص کی مکمل آگہی ہو جاتی ہے۔ اس لیے خاکہ نگار کا اس شخص سے ذاتی طور پر واقف ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔

کامیاب خاکہ نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہوا ہو اور جو واقعات کی اوپری پرت کے نیچے معمولات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی حقیقتوں کو بھی اپنی گرفت میں لے سکے جن تک عام لوگوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں۔ اچھّے خاکہ نگار کی پہچان یہ ہے کہ وہ موضوع کو جس طرح دیکھتا، سمجھتا اور اس سے متاثر ہوتا ہے ہو بہ ہو اس کی ویسی ہی تصویر پیش کر دے جس سے پڑھنے والے کے اس شخصیت کی منفرد خصوصیات سے واقف ہو سکیں اور متاثر بھی۔

خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلوبِ بیان کا خاص خیال رکھے۔ تحریر نہ تو اتنی خشک ہو کہ طبیعت کی بے زاری کا سبب بنے اور نہ ہی دلچسپی کے لیے بے وجہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش ہو۔

غالبؔ کے خطوط اور محمد حسین آزاد کی کتاب 'آبِ حیات' میں خاکہ کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں لیکن اردو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز فرحت اللہ بیگ نے کیا۔ انھوں نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ بڑی دیانت داری کے ساتھ لکھا۔ ان کے علاوہ مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی، مجتبیٰ حسین، وغیرہ نے بھی بہترین خاکے لکھے۔

سبق (6) مولوی عبدالحق

مختصر سوانح

(1) نام : مولوی عبدالحق

(2) ولادت : 20 اگست 1870ء ہاپوڑ

(3) وفات : 16 اگست 1961ء کراچی

(4) مشہور تصانیف: چند ہم عصر، قواعدِ اردو، اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام

بابائے اردو مولوی عبدالحق ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں 20 اگست 1870ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانا ایک متوسط، خوش حال اور دیندار قسم کا تھا۔ والد شیخ علی حسین سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے۔ وہ مزاجاً بہت شریف اور ایماندار شخص تھے۔ والدہ بھی بہت نیک اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ گھر کے اسی ماحول میں عبدالحق پلے بڑھے۔ حق پرستی، دیانت داری اور اعلیٰ ظرفی کے اوصاف سے ان کی شخصیت مزین تھی۔ کھیل کود کے بجائے کتاب بینی کا شوق انہیں بچپن سے ہی تھا۔

دسویں مکمل کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں محمڈن انگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ وہاں سرسید جیسی کھری اور افعال شخصیت نے ان کی صلاحیتوں کو پھلنے اور پھولنے کا پورا موقع فراہم کیا۔

تاریخ اور فلسفہ ان کے اختیاری مضامین تھے۔ان کے مطالعے سے عبدالحق میں حق پرستی اور غور وفکر کے جذبے کو تقویت ملی۔علی گڑھ میں قیام کے دوران انھوں نے تہذیب الاخلاق کے لیے مضامین بھی لکھے۔

علی گڑھ سے بی۔اے مکمل کرنے کے بعد **1895** ء میں روزگار کی تلاش میں حیدرآباد کا رخ کیا۔شروعات میں ریاست حیدرآباد کے دفتر میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔لیکن جلد ہی اپنی لیاقت اور صلاحیت کی بنیاد پر مدرسہ ''آصفیہ'' حیدرآباد میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اپنی محنت اور لگن سے اس کا معیار و وقار بلند کیا۔ وہ انتظامی امور کے علاوہ درس وتدریس میں بھی شامل رہے۔اس کے بعد **1911** ء میں ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔وہ چاہتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم بھی بذریعۂ مادری زبان یعنی اردو زبان میں ہونی چاہیے۔ان کا یہ خواب ان کی شدید محنت ومشقت کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا ۔اس یونیورسٹی میں درس وتدریس کے لئے اردو زبان میں کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے لئے دارالترجمہ قائم کیا گیا۔اس ادارے کی سربراہی بھی مولوی عبدالحق کے حصہ میں آئی۔اس ذمہ داری کو بھی انھوں نے بحسن وخوبی نبھایا۔اس کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کے طور پر بھی اپنی خدمت انجام دیں۔

جب **1911** ء میں انھیں اس کا سکریٹری بنایا گیا تو انھوں نے اس انجمن کو اپنی کوششوں سے ایک کارآمد اور بامقصد ادارے میں تبدیل کیا اور اسے ایک منفرد شناخت بخشی۔رسالہ اردو کی ادارت بھی ان کا ایک اہم ادبی کام ہے۔قدیم کتابوں کی تدوین، ترتیب واشاعت ان کے ایسے کام ہیں جو ہمیشہ یاد

رکھے جائیں گے۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں الٰہ آباد یونیورسٹی نے ایل.ایل.ڈی.اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی.لٹ.کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ **16** اگست **1961**ءکو کراچی میں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

حالؔی

مجھے اپنے زمانے کے نام ور اصحاب اور اپنی قوم کے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سر سید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالؔی کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سر سید بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، یا جو ان سے ملے ہیں، وہ ضرور اس قول کی تصدیق کریں گے۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے جو کوئی ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور پھر عمر بھر ان کے حسن اخلاق کا مداح رہتا تھا۔ ان کا رتبہ بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے، لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک بار وہ جب علی گڑھ میں مقیم تھے، میں اور مولوی حمید الدین مرحوم ان سے ملنے گئے تو وہ سر وقد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر مجحوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں؟ آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے پردہ اٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھالیا۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد کھانا منگوایا۔ انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت شوقین تھے۔ پانی پت کی ملائی بہت مشہور تھی۔ ان کے لیے ملائی منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا پھر ان کے لیے پلنگ بچھوا کر بستر کرا دیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے، پڑ کر سو رہے۔ مولوی انوار احمد کہتے تھے کہ رات کے بارہ ایک بجے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رضائی کو آہستہ آہستہ چھو رہا ہے۔ انھوں نے چونک کر پوچھا کون؟ مولوی صاحب نے کہا ’’میں ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے، مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اوڑھا رہا تھا۔ انوار احمد صاحب کہتے تھے کہ ’’مجھ پر ان کی اس شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں بھول سکتا‘‘۔ مہمان کے آنے سے (اور اکثر ایسا ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اس کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں

تک اختیار میں ہوتا، اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے۔ باوجودیکہ ان کی آمدنی قلیل تھی، لیکن اپنے پرائے، خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروت ایسے تھے کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مندان کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم وملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انھیں بہت رنج وافسوس ہوتا تھا۔ تحریر وتقریر میں تو کیا نجی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے بھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا، جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو، بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا، تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انھیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

نام ونمود چھو کر نہیں گیا تھا، ورنہ شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی، بلکہ شیوہ ہوگئی ہے۔ وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے۔ اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے، باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کر کے اپنی فضیلت جتانا، اور اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں، شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آگئی ہے، مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے

جانے نہیں پایا مثلاً:

گرچہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش! ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

یا

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اس سے بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دوکاں سب سے الگ

ان کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجے کا تھا۔ جیسا کہ ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''مقدمہ شعرو شاعری'' سے ظاہر ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں، جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آپڑتی، تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر سے اس لیے فرمائش کرتا ہے کہ اسے بھی اپنا کلام سنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے بعد مخاطب بھی اس سے یہی فرمائش کرے گا، اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بغیر فرمائش ہی اپنے کلام محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے (بعض شاعر تو اس کے لیے بے چین رہتے ہیں)، لیکن بعض لوگ سچے دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کسی بڑے شاعر کا کلام اس کی

زبان سے سنیں۔ لوگ مولانا حالؔی سے بھی فرمائش کرتے تھے، وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ میرا ''حافظہ بہت کمزور ہے، اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا'' یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا، اس میں کچھ حقیقت بھی تھی لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں، ان کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور جسم سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے تھے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔ انھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم صاحب کو دی جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے سلیم صاحب ایک ہی بند پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا۔ نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی۔ ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسید تو خیر اس زمانے میں مورد لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس و ناکس ان پر منہ آتا تھا لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار پڑی وہ حالؔی تھے۔ ایک تو ہر وہ شخص جس کا تعلق سرسید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہل لکھنؤ اس معاملے میں چھوٹی

موئی سے کم نہیں۔ وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ ساری کارروائی ان ہی کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا۔ ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن وتعریض کی صدا آنے لگی۔ ''اودھ پنچ'' میں ایک طویل سلسلہ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا، بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی:

ابتر ہمارے حملوں سے حالؔی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجیے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ کی گئی ہوگی مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے ، لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا:

کیا پوچھتے ہو؟ کیوں کر؟ سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے، پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہی لوگ جو انہیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے،ان کی تقلید کرنے لگے۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں ؎

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب وغریب مادّہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو، وہ صبر کے ساتھ رہتے تھے۔

جواب دیتے تھے، لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا، لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں ان کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے۔ یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے، ورنہ جوش میں آ کر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو بیٹھتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے، اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصنیفات مالِ یغماں تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے! خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

قیامِ حیدر آباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں، مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سُنا کیے۔ مولانا نے یہ فرمایا کہ ''میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی؟ لیکن تنقید میں ذاتیات سے

بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا، منصب تنقید کے خلاف ہے۔''

مولانا حالی انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہوسکا لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا کہ وہ سمجھتے تھے، اس وقت بہت سے انگریز تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔ اور جو یہ سمجھتے تھے، وہ کر کے دکھایا۔ آج سینکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں، لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشر عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے، بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے، اس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انھوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا، جو اب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے، اور ایک پبلک اورینٹل لائبریری قائم کی، جو پانی پت میں سب سے بلند اور پر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے، جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

مولانا کمزوروں اور بیکسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے انھوں نے ہمیشہ حمایت کی یہ ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' یہ دو ایسی نظمیں ہیں، جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرعے سے خلوص، جوش، ہم دردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں، دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے

کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے، شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا، مگر وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے، خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے، لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کے نام حیدر آباد میں ایک روز ''اولڈ بوائے'' آیا، تو اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخرا پن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انھیں علی گڑھ کے طلبہ سے اس سے اعلیٰ توقع تھی۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا کہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈراما لکھیں، لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔

آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں: ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا

اور ایک کوئی اور بات تھی، جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد میں ہوا تھا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی ہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے۔ پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پر فضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آیئے، صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آ کر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے، مگر ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب رضامند نہ تھے۔ عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے ضعیفی کا عالم ہے، طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلاف مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کچھ کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آ ؤ، تو دو ایک روز کے لیے پانی پت بھی چلے آنا۔ اس وقت میں تمھارے ساتھ ہولوں گا۔ پھر کوئی چوں و چرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا، تو وہ بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

معنی اور اشارے:

خصائل	=	عادتیں (خصلت کی جمع)
تصدیق	=	سچ ہونے کی تائید کرنا
فروتنی	=	غرور کا نہ ہونا، انکسار
سروقد کھڑا ہونا	=	سیدھا کھڑا ہونا
محجوب	=	شرمندہ ہونا
ناخدا	=	ملاح
رقیق القلب	=	جس کو جلدی سے رونا آجائے
تخصیص	=	خصوصیت
نزاع	=	لڑائی جھگڑا
دل آزاری	=	دل دکھانا
نام ونمود	=	نمائش، ظاہر داری
تعلّی	=	اپنی بڑائی کرنا
شیوہ	=	عادت
فضیلت	=	برتری، عظمت

عذرِ لنگ = جھوٹا یا کمزور بہانہ

تحت اللفظ = شعر کو بغیر ترنم کے پڑھنا

موردِ لعن وطن = لعنت کا مستحق

تعریض = اشارتاً کسی پر اعتراض کرنا

کٹھ حجتی = اپنی بات پر اڑے رہنا

سررشتۂ اعتدال = کام اور برتاؤ کا وہ طریقہ جس میں نہ زیادتی ہو نہ کمی ہو، بیچ کا طریقہ

قانع = اپنے پاس جو کچھ ہو اس سے زیادہ کا لالچ نہ کرنے والا

مالِ یغما = لوٹ کا مال، وہ چیز جو مفت ہاتھ آجائے۔

مسدس = چھے چھے مصرعوں کے بند والی صنفِ سخن، نیز حالی کی مشہور نظم ''مدو جزر اسلام کو بھی مسدس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سیر چشمی = غنی ہونا، لالچ کا نہ ہونا

عُشرِ عشیر = دسویں حصے کا دسواں حصہ یعنی بہت تھوڑا سا

مفکر = فلسفی، سوچنے والا، فکر کرنے والا

مستفید = فائدہ حاصل کرنے والا

مترشح = ٹپکتا ہوا، لہٰذا بالکل ظاہر

منضبط کرنا	=	اصول اور قاعدے کے لحاظ سے مرتب کرنا
مقیم	=	قیام ہونا، ٹھہرنا
تعظیم	=	عزت
حاجت مند	=	ضرورت مند
مطلف	=	ذرا سا
جدید تعلیم	=	عصری تعلیم، انگریزی تعلیم

کثیرالجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) مولوی عبدالحق کو بچپن میں کس چیز کا شوق تھا؟

(a) پتنگ اڑانے کا　　**(b)** پیراکی کا

(c) پڑھنے کا　　**(d)** گھومنے کا

(2) مولوی عبدالحق نے بی۔اے کی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

(a) محمڈن انگلواورینٹل کالج　　**(b)** دہلی کالج

(c) میسور کالج　　**(d)** فورٹ ولیم کالج

(3) حالی کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a) دہلی (b) پانی پت

(c) لکھنؤ (d) حیدرآباد

(4) سبق بعنوان ''حالی'' مصنف مولوی عبدالحق صنف کے اعتبار سے کیا ہے؟

(a) سوزنامہ (b) افسانہ

(c) ناول (d) خاکہ

(5) علی گڑھ میں قیام کے دوران کس رسالہ میں مولوی عبدالحق کے مضامین شائع ہوئے تھے؟

(a) مخزن (b) ہمایوں

(c) تہذیب الاخلاق (d) تہذیب نسواں

مختصر ترین سوالات (Very Short type questions) :

(1) مولوی عبدالحق نے کس رسالہ کی ادارت کی؟

(2) محمڈن انگلو اورینٹل کالج کہاں ہے؟

(3) محمڈن انگلو اورینٹل کالج میں عبدالحق کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع کس نے دیا؟

(4) مولوی عبدالحق علی گڑھ میں تعلیم مکمل کرنے بعد روزگار کی تلاش میں کہاں گئے؟

(5) حالی کس طرح کے اتحاد کے حامی تھے؟

(6) بے تعصبی کا وصف کن لوگوں میں پایا جاتا ہے؟

(7) کس رسالہ میں مقدمہ شعر و شاعری کے خلاف مضامین چھپتے تھے؟

مختصر سوالات (Short type questions) :

(1) مولوی عبدالحق عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے لیے کیوں فکرمند تھے؟

(2) دارالترجمہ کیوں قائم کیا گیا؟

(3) حالؔی کی کچھ کتابوں کے نام بتائیے؟

(4) حالؔی کی مہمان نوازی کے تعلق سے کوئی واقعہ بتائیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) مولوی عبدالحق نے فروغ اردو کے لیے کیا کوششیں کیں؟

(2) مولوی عبدالحق نے حالی کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا ہے؟

مضمون

وہ تحریر یا عبارت جس میں ربط و تسلسل ہو اور جو کسی موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہو، مضمون کہلاتی ہے۔ مضمون کو انگریزی میں **Essay** کہتے ہیں۔ یہ ایک غیر افسانوی صنف ہے۔ اس کی داغ وبیل قدیم دہلی کالج کے ساتھ پڑی۔ سر سید احمد خاں کے رسالہ تہذیب الاخلاق نے بھی مضمون نگاری کی روایت کو استحکام بخشا جس میں مختلف قسم کے علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

مضمون نویسی کے لیے موضوعات متعین نہیں؛ کسی بھی موضوع پر مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح اس کے ذیل میں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، سیاسی، سماجی، سائنسی اور صحافتی یعنی ہر قسم کی تحریریں آ جاتی ہیں۔

ایک اچھے مضمون کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا انداز سادہ ہو۔ تکلف، تصنع اور پیچیدگی کو مضمون نگاری کے ضمن میں عیب سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ یہ چیزیں تفہیم و ترسیل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ لیکن مضمون کی زبان کو معیاری اور اسلوب کو دلکش و جاذبِ نظر ہونا چاہئے۔

سر سید احمد خاں، ماسٹر رام چندر، مولانا الطاف حسین حالؔی، شبلؔی نعمانی، مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری وغیرہ نے مضمون نگاری کی روایت کو فروغ دیا اور اسے بامِ عروج تک پہنچایا۔

سبق (7) سید احتشام حسین

مختصر سوانح

(1) نام : سید احتشام حسین

(2) ولادت : 21 اپریل 1912ء ماہل (یوپی)

(3) وفات : 1 دسمبر 1972ء الہ آباد (پریاگ راج)

(4) مشہور تصانیف: اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ویرانے، ساحل وسمندر وغیرہ۔

سید احتشام حسین کی پیدائش 21 اپریل 1912ء کو گاؤں ماہل، اعظم گڑھ، صوبہ اتر پردیش میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے 1936ء میں ایم، اے کیا۔ 1938ء میں لکھنؤ کے شعبۂ اردو، فارسی میں بحیثیت لکچرار تقرر رہوا۔ وہ 1961ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ مختلف علمی اور ادبی اداروں کے وہ سرگرم رکن تھے۔ یکم دسمبر 1972ء کو دل کا دورا پڑنے سے اچانک موت ہوئی۔ احتشام حسین کی اہم تصانیف میں تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید، ذوق ادب اور شعور، عکس اور آئینے، افکار اور مسائل، اعتبار نظر وغیرہ

ہیں۔انھوں نے جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے نام سے کیا۔افسانوں کا مجموعہ ''ویرانے'' اورسفرنامہ ''ساحل اورسمندر'' بھی ان کی اہم تصانیف ہیں۔

احتشام حسین اردو کے مشہور ناقد رہے ہیں۔انھوں نے افسانے، انشائیے،غزلیات،نظمیں، ناٹک،مضامین وغیرہ لکھے۔تاریخ ادب اورلسانیات کے میدان میں بہت اہم کام انجام دیے ہیں جو مارکسی تنقید سے مناسبت رکھتے ہیں۔ان کےتنقیدی مضامین میں سلجھاہوا،واضح ،سنجیدہ،اور مدلل انداز ملتا ہے۔احتشام حسین کی زبان صاف ستھری اورغیرمبہم ہے۔احتشام حسین کوادب میں اشترا کی تنقید کا سب سے بڑا ترجمان مانا جاتا ہے۔

نصاب میں شامل مضمون''ہندوستانی تہذیب کے عناصر'' احتشام حسین کی تنقیدی کتاب ''تنقیدی جائزے'' سے لیا گیا ہے۔اس میں ہندوستانی تہذیب وتاریخ کا بیان ہے۔مختلف تہذیب کے امتزاج نے ہندوستان کی جڑوں کواوربھی زیادہ مضبوط کیا ہے۔دراوڑ،آریائی،اسلامی تہذیب نے مل کر ہندوستان کومضبوط بنایا ہے۔

ہندوستانی تہذیب کے عناصر

ادھر تھوڑے دنوں کے اندر بعض ہندوستانی رہنماؤں کے بیانات اور تقریروں نے ہندوستانی تہذیب کے متعلق بنیادی سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ رہنما ابھی تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کی قومی وحدت کے قائل تھے۔ ایسی قومی وحدت جس کی تعمیر و تشکیل میں مختلف عناصر کارفرما رہے ہیں، لیکن آج وہ اس تہذیبی سرمائے کو اپنے مخصوص عصبیت آمیز خیالات اور رجعت پسندانہ جذبات کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں۔ جسے مختلف قومیت اور مذہب رکھنے والوں نے کم و بیش پانچ ہزار سال میں اکٹھا کیا ہے۔اس جارحانہ قومیت پرستی نے معاشرت زبان، سیاسی مطمح نظر ہر چیز میں ایک طرح کا غیر جمہوری اور فسطائی رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وقت ضائع کیے بغیر ہندوستانی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی جانچ پڑتال ضروری ہے ورنہ ہزار ہا سال کے بطن سے پیدا ہونے والی قدریں اور مستقبل کے امکانات دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ ہم تہذیب کی ایسی تعریف نہ بتا سکیں جو سقراط کے معیار پر پوری اترے لیکن جب ہم یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنھیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ پانچ ہزار سال

گزرے دراوڑیوں کے عروج کے زمانے میں ہندوستان ایک اعلی درجہ کا تمدن رکھتا تھا۔ دراوڑی قوم یہاں کئی دوسری قوموں کے بعد آئے تھے لیکن انھوں نے اس سرزمین سے مکمل مطابقت اختیار کرلی تھی۔ کوئی ڈیڑھ ہزار قبل مسیح آریہ آئے ان کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ دراوڑیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور روحانی و مادی طاقتوں سے ان کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے پر مسلح تھے۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کے زرخیز میدانوں پر قبضہ کرلیا اور دراوڑیوں کو وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔ تاریخ کا یہ ایک مابہ النزاع مسئلہ ہے کہ دراوڑی اور آریائی تہذیب کے سوتے کہاں تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں ہندوستان میں کتنا اختلاط ہوا۔ لیکن اتنا ضرور صحیح ہے کہ آریوں اور دراوڑیوں کی علاحدگی کی وجہ سے بہت دنوں تک ان میں وہ اختلاط پیدا نہ ہوسکا جو مکمل امتزاج کا ضامن ہوتا۔ زبانوں کے اختلاط سے تہذیبیں ایک دوسرے میں جلد مدغم ہوتی ہیں لیکن یہاں یہ دشواری پیش آئی کہ آریہ اپنی ترقی یافتہ مہذب سنسکرت کے سامنے دراوڑی زبانوں سے بے نیازی کا اظہار کرتے رہے اور دونوں زبانوں کی لسانی ساخت میں جو افتراق ہے وہ ایک دوسرے سے الگ رہنے میں اعانت کرتا رہا۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ذات پات کی تفریق، ذرائع آمدورفت کی کمی اور برہمنوں کی مذہبی سخت گیری کے باوجود ہندوستانی تہذیب کی تشکیل اس طرح ہوتی رہی کہ اس میں دراوڑی رنگ کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

بودھ اور جین مت ہندوستانی زندگی میں زبردست انقلاب تھے لیکن انھیں یہاں کی تہذیبی زندگی میں کوئی انوکھی چیز سمجھنا کوئی ایسا واقعہ سمجھنا جو تاریخی بہاؤ میں بالکل الگ تھلگ معلوم ہو صحیح نہیں، یہ بھی

تہذیب کا تسلسل تھا جو ڈھائی ہزار سال میں ایک خاص شکل اختیار کر چکی تھی۔ آریوں نے ہندوستان کے ہزار سالہ قیام میں جو قدریں پیدا کی تھیں بودھ مت نے انھیں نئے پہلو اور نئے رنگ دیے۔ برہمنی نظام کی رسم پرستی اور سخت گیری نے ان قدروں اور فکری کارناموں کو جمود کی ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا تھا، جہاں انقلاب کی ضرورت تھی۔ یہ عوامی سماجی انقلاب ان نئے مذاہب کی شکلوں میں رونما ہوا۔ وہ زنجیریں ٹوٹ گئیں جنھوں نے تہذیبی ارتقا کو روک رکھا تھا اور ہندوستانی تفکر کے لیے نئی راہیں کھل گئیں۔ بودھ مذہب جب شروع ہوا، اس وقت تو وہ برہمنی نظام کے خلاف ایک زبردست بغاوت معلوم ہوتا تھا، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے اندر تحقیق حق کی جستجو میں انسانی مسرت کی تلاش میں دونوں نظام ایک ہو گئے ۔ ہندوستان دنیا کی نظر میں بہت اوپر اٹھ گیا اور ملک کی عوامی زندگی کی سطح بلند ہو گئی۔ پراکرتیں جو محض عام عورتوں اور غلاموں میں رائج تھیں، نئے ڈھانچے میں اہم جگہ اختیار کر گئیں۔ قدیم آریائی تہذیب کی حدیں اس طرح وسیع ہو گئیں کہ اس کی کوئی خصوصیت جو زندہ رہنے کے قابل تھی ضائع نہیں ہونے پائی۔ پھر ویشنوی تحریک شروع ہوئی جسے بعد میں عام طور سے بھگتی کی تحریک کہا جانے لگا۔ بودھ مذہب سے اثر لے کر اور بعد میں اسلام سے متاثر ہو کر اس تحریک نے مذاہب کی عالمگیر صداقتیں پیش کیں۔ ہندو مذہب کی آفاقیت اپنی فلسفیانہ تفصیلات کو چھوڑ کر نتھری ہوئی شکل میں سطح پر ابھر آئی اور پھر اس نے اپنا فلسفیانہ نظام بنا لیا جو اس تہذیب میں مل گیا جسے ہزاروں سال میں تیار کیا گیا تھا۔ بھگتی تحریک نے مذہبی ظاہر داریوں اور رسمی عبادت پر کاری ضرب لگائی اور جب ہندو تمدن میں گھن لگ چکا تھا اور بودھ مذہب

میں رسم پرستیاں شروع ہوگئی تھیں، بھگتی تحریک کے فلسفی نئی طاقت لیے ہوئے آئے جب اسلام ہندوستان میں آیا تو اس تحریک میں اسلام کی صداقتیں اور ہندوستانی مذاہب کی صداقتیں کئی پہلوؤں سے مل گئیں۔

اسلام عرب میں رونما ہو کر ایشیا اور افریقہ کے مختلف حصوں میں پھیل چکا تھا۔ ہندوستان سے عربوں کا تعلق قدیم تھا لیکن اس میں تہذیبی لین دین برائے نام ہوا تھا اصل تعلقات دسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئے جب مسلمان بڑی تعداد میں ہندوستان میں آئے۔ اسلام سامیوں میں پیدا ہوا تھا ،لیکن بہت جلد ایران ، ترکستان اور وسط ایشیا میں پہنچ گیا جہاں قدیم آریائی نسل کے لوگ آباد تھے۔ مسلمان کئی صدیوں تک زرتشت اور اوستا کے ایران میں رہ کر وہاں کی تہذیبی زندگی میں ڈوب کر ہندوستان آئے۔ ایرانی مسلمانوں کی زندگی میں سامیت اور ایرانیت کی آمیزش ہوگئی تھی۔ مسلمان آریوں کی طرح یہاں آ کر آباد ہو گئے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ہندوستانیت نمایاں ہوگئی۔ عرب سے ان کا صرف ایک قسم کا روحانی تعلق باقی رہ گیا، ورنہ طرز بود و ماند، طریقہ حکومت اور دوسری حیثیتوں سے وہ ہندوستانی زندگی میں پوری طرح شریک ہوگئے۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں بس جانے سے وہ تہذیبی تسلسل ختم نہیں ہوا بلکہ تہذیبی زنجیر میں نئی کڑیوں کا اضافہ ہوگیا جس نے اسے اور مضبوط وسیع اور وزنی بنا دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے زبردست حکومتیں قائم کیں انھوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے خود مسلمانوں سے لڑائیاں لڑیں اپنے بھائی بندوں کا خون کیا۔ تاج و تخت کے لیے جنگ کرتے ہوئے کبھی مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں

کیا۔انھوں نے مسلمان بن کرنہیں بادشاہ بن کرحکومت کی ،اور مذہبی تبلیغ کو اپنی حکمت عملی کا جزو کبھی نہیں بنایا۔ان کی حکومت کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے باج گزار ریاستوں پر اکتفا کر کے مرکزیت اور مطلق العنان حکومتوں پر زیادہ زور دیا اور جاگیرداری تمدن کو اور زیادہ جاندار بنایا۔ وہ یہیں جیے، یہیں مرے، انھوں نے اس سرزمین سے محبت کی اور کبھی اس ملک کو چھوڑ کر باہر جانے کا خواب بھی نہیں دیکھا۔

مسلمان بادشاہوں اور صوفی درویشوں نے موسیقی ،ادب ، زبان تعمیر فنون لطیفہ اور دوسرے دیگر تہذیبی اداروں کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں جتنا حصہ لیا اور ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ قومیت کی تعمیر میں غیر شعوری طور پر ہی سہی جو کوششیں کیں ان کا افسانہ تاریخ کی زبان پر ہے۔جس بات کو اچھی طرح سمجھنا ہے وہ اس ہندوستانیت کی نشو ونما ہے، جو ہندو مسلمانوں کے اختلاط سے پیدا ہورہی تھی ،اس تہذیب نے کبیر، گرونانک ، اکبر، خانخاناں، دادو دیال، ریداس، تان سین ، اور داراشکوہ پیدا کیے۔اس نے ہنداسلامی طرز تعمیر موسیقی اور مصوری کو جنم دیا اور ایک نئی آریائی زبان کی تخلیق کی ،اس زبان کو ہندوستانی کہا جاتا ہے۔اس نے ہندوستانی تہذیب کی روح اپنے اندر جذب کی تھی اور پہلی مرتبہ ملک نے لسانی اتحاد کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ یہ تاریخی اور سماجی ارتقا کے تقاضوں کو پورا کر رہی تھی۔اس لیے ہندو اور مسلمان دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔اسی کی ایک شکل کا نام اردو ہے۔ اس زبان کے یا اس میں پیدا ہونے والے سرمائے کے لیے بدیشی یا غیر ملکی کا لفظ استعمال کرنا تاریخ

تمدن سے ناواقفیت کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ بد مذاقی اور بے انصافی بھی ہے۔ زبان اسی وقت مذہبوں سے متعلق کی جاسکتی ہے جب ذہن بیمار ہو اور نظر پر تعصب اور فرقہ پرستی کے جذبات نے پردے ڈال دیے ہوں۔ اسی طرح یہ سوچنا آریہ نہ آتے تو دراوڑی ہوتے، مسلمان نہ آتے تو صرف آریہ ہوتے، انگریز نہ آتے تو مسلمانوں کی حکومت ہوتی محض خود فریبی ہے۔ جو کچھ ہو چکا اور اس کا جو حصہ قابل قدر ہے اسے تسلیم کرنا ہی مستقبل کی ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے۔

جب دو قومیں ملتی ہیں تو دونوں میں تہذیبی لین دین ضرور ہوتا ہے، اس لین دین کی نوعیت اور مقدار سے تہذیبی تعلقات کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں نظر انداز کرنے سے تاریخ نہیں بدل سکتی، لیکن بعض قومی رہنما تاریخی ارتقا سے نظر بچا کر اسے اپنی ذاتی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں میں علاوہ مذہب کے ظاہری رخ کے اور کوئی چیز بیرونی یا بدیسی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ ایران کے آریہ اور ہندوستان کے آریہ دو ہزار سال کے قریب ایک دوسرے سے الگ رہنے کے بعد پھر ایک دوسرے سے ملے تھے اور انھیں ایک دوسرے کے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں مذہب یا تہذیب کی بنیاد پر بھی آپس میں جھگڑے نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس انگریزی عہد حکومت کی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت اور اس کے اثرات سے ہم کافی واقف ہیں، لیکن تہذیبی نقطہ نظر سے اس تاریخی دور کا تجزیہ پھر سے کرنے کی ضرورت ہے۔ انگریزوں کی مضبوط مرکزی حکومت

نے تہذیبی وحدت کو پارہ پارہ کر کے تفریقی رجحانات کو بڑھایا، اوراس ہندومسلم اتحاد کا خاتمہ کر دیا جس کا خمیر صدیوں میں اٹھا تھا۔ چنانچہ یہ ان اداروں کی نوعیت اور شکل کو فرقہ وارانہ رنگ دینے میں کامیاب ہوگیا جو مدتوں سے چلے آرہے تھےاور حکمرانوں کی ساحری نے وہ خواب دکھائے کہ ہر شعبہ زندگی میں تفرقہ ہی تفرقہ دکھائی دینے لگا۔ تاریخی تقاضوں نے جن اختلافات کو بہت گہرائی میں دفن کر دیا وہ ابھر آئے اور نیم جاگیردارانہ نیم صنعتی نظام زندگی میں انھیں پنپنے کی نئی غذا ہاتھ آ گئی۔ جدید سیاست کا یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ ان فتنوں کو پال سکتی ہے جو مرتے مرتے بھی نہیں مرتے۔ چنانچہ اونچے اور متوسط طبقہ کے وفاداروں نے دانستہ اور نادانستہ اپنے غلام بنانے والوں کا ساتھ دے کر مشترک قدروں کے ان رشتوں کو توڑ ڈالا جو عام زندگی کی مشترک معاشی معاشرتی ضروریات سے بنے اور مضبوط ہوئے تھے۔ انھوں نے اختلافی اور تفریقی رجحانات کو یہاں تک بڑھایا کہ آخر کار ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ جن لوگوں نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ اس کے متعلق غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں اور ایسی غلط فہمی پھیلاتے ہیں جس کے نتائج مہلک ہو سکتے ہیں۔ اردو شعرا کی فہرست سے نہ جانے کتنے نام اور ان کے دواوین سے نہ جانے کتنے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے ان کی افتادِ ذہنی کا پتہ چل سکتا ہے۔ وہ اتحاد انسانی اخوت اور محبت کے مبلغ تھے۔ ان کے اشعار سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ ہر مذہب کے انسان تھے۔ وہ اس خدا کا ذکر کرتے تھے جو انسان کی روح میں موجود ہے۔ وہ حشر ونشر کا مذاق اڑاتے تھے۔ جنت اور دوزخ پر ہنستے تھے۔ ان کے

خیالات ان ویشنوی بھگت شعرا سے ملتے جلتے ہیں جو صرف مذہب کی روح کو پیش کرتے ہیں۔ان شعرا کا مذہب بھی انسان کی محبت اور سچائی کی پرستش ہے اگر کوئی شخص شاعرانہ استعاروں اشاروں اور علامتوں کو نہ سمجھے تو وہ کس طرح اردو شاعری کے متعلق رائے دے سکتا ہے۔مثالوں سے دفتر تیار ہو سکتے ہیں لیکن ان سے اسی وقت فائدہ ہوسکتا ہے جب کوئی کھلے دل سے انھیں سمجھنا چاہے۔جب نگاہ بلنداور قلب وسیع ہو۔اس وقت اردو کے بہت بڑے شاعر......غالباً سب سے بڑے شاعر..غالب کا خیال آتا ہے جس کا فلسفیانہ ذہن ہندو فلسفے کی بنیادوں کو پیش کرتا تھا۔کیا یہ اشعار تفریقی رجحانات پھیلانے کی مثال میں پیش کیے جاسکتے ہیں؟

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

زنار باندھ سُبحۂ صدّ دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

نہیں کچھ سبحۂ وزنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رُسوم
ملتّیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ان اشعار میں شیخ اور برہمن کی تفریق مٹ کر نئی انسانی برادری قائم ہوتی ہے جس کا مذہب محبت سے موسوم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض شاعر ایسے ہوں یا کچھ اشعار ایسے ملیں جن کا مذہبی جذبہ انسانی محبت کے اس جذبے کو دبا دیتا ہو کہ اس سے تفریقی رجحان نمایاں ہوتا ہو... لیکن اردو شاعری کا یہ عام رنگ نہیں ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں یہ ادب غدر **1857** ء کے بعد سے اب تک ہزاروں حیثیت سے پیش پیش رہا ہے۔ شعلہ بار افسانے اور آتشیں نظمیں اس کے ادبی سرمائے میں لاتعداد ہیں، آج بھی اس کا پیام سماجی انصاف اور جمہوریت ہے۔ آزادی کی مضبوط تاریخ اردو ادب کے سرمایے سے مرتب کی جاسکتی ہے، ایسی زبان اور ادب کو بدیسی کہنا یا اس پر تفریقی ہونے کا الزام لگانا رجعت پسندی ہے۔ اردو ادب

ہندوستانی تہذیب کے ڈھانچے میں اسی طرح اپنی جگہ رکھتا ہے جس طرح ہندوستان کا کوئی دوسرا ادب۔

ہندوستانی تہذیب سے ان قدروں کا ارتقا مراد ہے جو ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں اور مذہبوں نے پانچ ہزار سال میں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ اگر مسلمانوں یا ہندوؤں کا ایک گروہ اسے تسلیم نہیں کرتا تو اس سے تاریخی حقیقتیں نہیں بدل سکتیں۔ کچھ مسلمانوں نے اگر قومی وحدت اور مشترک تہذیب کو نہیں مانا تو اس سے علمی تحقیق کے نتائج غلط ثابت نہیں ہو سکتے۔

اس لیے ہمارے سامنے بڑے اہم سوالات ہیں، ہماری تہذیب اور زبان مذہب یا فرقہ پرستی کے ماتحت ہوں گی یا ان کی بنیاد جمہوری اور غیر مذہبی ہوگی؟ اسے سماجی انصاف اور سچائی کی بنیاد پر کھڑا کیا جائے گا یا آمرانہ یا فسطائی بنیاد پر؟ ان سوالوں کے جواب پر ہندوستان کی عظمت اور اس کے تہذیبی ارتقا کا مستقبل منحصر ہے، اور ان کا جواب اس سے پہلے دینا ہے کہ وفاداری اور قوم پرستی کے نام پر جو زہر پھیلایا جا رہا ہے، وہ کان و ذہن سے گزر کر رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

معنی اور اشارے:

عناصر	=	عنصر کی جمع، وہ چیز جو کسی چیز کا حصہ ہو
عصبیت	=	بے جا طرف داری
جمود	=	ٹھہراؤ
مطابقت	=	مشابہت، برابری
سقراط	=	یونان کا ایک فلسفی جو افلاطون کا استاد تھا
فسطائی	=	اٹلی کے ظالم ڈیکٹیٹر سمولینی کے خیالات کو ماننے والا
مابہ النزاع	=	جھگڑے کی وجہ
اختلاط	=	میل جول
ساخت	=	بناوٹ
ارتقا	=	ترقی، آہستہ آہستہ آگے بڑھنا
سامیوں	=	سام کی نسل کے لوگ
طرز طور و ماند	=	رہنے سہنے کا طریقہ
استحکام	=	مضبوطی
مطلق العنان	=	اپنی مرضی سے کام کرنے والا
اتحاد	=	ملاپ، دوستی

تعصب = تنگ نظری

وحدت = ایک ہونا

اخوّت = بھائی چارہ

مبلغ = پہنچانے والا

سرمایہ = پونجی

جمہوریت = وہ نظام جس میں چنے ہوئے نمائندوں کی جماعت حکومت چلاتی ہے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔

تفریقی = فرق والی

مشترک = ملی جلی

جستجو = تلاش

دہن = منھ

سرایت = اثر ہونا، جذب ہونا

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) احتشام حسین کس سن میں پیدا ہوئے؟

(a) **1911**ء (b) **1912**ء

(c) **1927**ء (d) **1936**ء

(2) ''ہندوستانی تہذیب کے عناصر'' کس کا مضمون ہے؟

(a) آل احمد سرور (b) احتشام حسین

(c) کلیم الدین احمد (d) گوپی چند نارنگ

(3) ''تنقیدی جائزے'' کس کی تصنیف ہے؟

(a) احتشام حسین (b) آل احمد سرور

(c) وقار عظیم (d) ممتاز حسین

(4) احتشام حسین کس یونیورسٹی میں اردو کے صدر شعبہ تھے؟

(a) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (b) الہ آباد یونیورسٹی

(c) دلی یونیورسٹی (d) بنارس ہندو یونیورسٹی

(5) احتشام حسین کا تعلق کس تحریک سے تھا؟

(a) علی گڑھ تحریک (b) ترقی پسند تحریک

(c) خلافت تحریک (d) حلقہ ارباب ذوق

مختصر ترین سوالات (Very Short type questions):

(1) احتشام حسین کہاں پیدا ہوئے؟

(2) احتشام حسین کا تنقیدی نظریہ کیا تھا؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) ''ہندوستانی تہذیب کے عناصر'' مضمون احتشام حسین کی کس کتاب میں شامل ہے؟

(2) سبق ''ہندوستانی تہذیب کے عناصر'' میں بھگتی تحریک سے کیا مراد ہے؟

(3) اردو زبان نے ''ہندوستانی تہذیب کی روح کو اپنے اندر جذب کیا'' اس خیال کی وضاحت کریں؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) درج ذیل اقتباس کی تشریح مع سیاق وسباق لکھیں:

''مسلمانوں کے ہندوستان میں بس جانے سے وہ تہذیبی تسلسل ختم نہیں ہوا بلکہ تہذیبی زنجیر میں نئی کڑیوں کا اضافہ ہوگیا۔ جس نے اسے اور مضبوط وسیع اور وزنی بنا دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے زبردست حکومتیں قائم کیں، انھوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے خود مسلمانوں سے لڑائیاں لڑیں اپنے بھائی بندوں کا خون کیا۔ تاج وتخت کے لئے جنگ کرتے ہوئے کبھی مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں کیا۔''

حصہ شعر و نظم

غزل

غزل اردو کی مقبول ترین صنف ہے۔اس کی روایت نہایت ہی قدیم ہے۔ابتدا ہی سے اردو میں غزلیں کہی جا رہی ہیں۔جس کے باعث اس صنف میں اسلوب اور مضامین کی سطح پر رنگا رنگی اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ابتدائی زمانے میں غزل میں حسن وعشق کے مضامین باندھے گئے اور اس میں محبوب کے ہجر و وصال، ظلم وستم اور مہربانی و کرم، اس کے حُسن و جمال، شوق وصال وغیرہ پر اشعار کہے گئے لیکن بعد میں حیات و کائنات کے دیگر مسائل پر بھی توجہ دی جانے لگی۔یعنی غزل میں مضامین کی قید نہیں ہوا کرتی ہے۔ ہر طرح کے مضامین اس میں داخل کیے جا سکتے ہیں۔

غزل ایسی صنف سخن ہے جس کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے۔مطلع غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔غزل میں ایک سے زائد مطلعے بھی ہو سکتے ہیں۔دوسرے مطلع کو مطلعِ ثانی اور تیسرے مطلع کو مطلع ثالث کہتے ہیں۔غزل کے آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے، جس میں شاعر اپنے تخلص کا اظہار کرتا ہے۔غزل کے بہترین شعر کو شاہ بیت یا بیت الغزل کہتے ہیں۔مطلع کے بعد کے شعر کو حُسنِ مطلع کہا جاتا ہے۔

معنوی اعتبار سے غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے اور جُداگانہ معنی کا حامل ہے لیکن ایسی

غزلیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں مضامین کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ایسی غزلوں کو غزل مسلسل کہتے ہیں۔

اردو میں قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک غزل کی ایک مستحکم روایت ملتی ہے۔اردو غزل کو جن شعرانے بام عروج پر پہنچایا اُن میں ولؔی دکنی، سراؔج اورنگ آبادی، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ، ناسخؔ، حیدر علی آتشؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، اکبرؔ الہٰ آبادی، شادؔ عظیم آبادی، یگانہؔ چنگیزی، اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مرادآبادی، حسرتؔ موہانی، ظفرؔ اقبال، ناصرؔ کاظمی، عرفانؔ صدیقی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سبق (8) الطاف حسین حالؔی

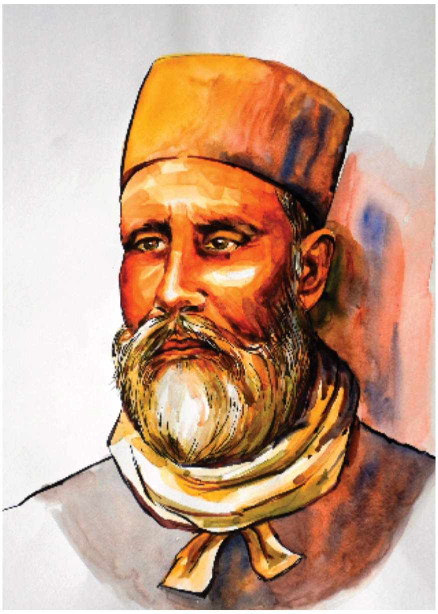

مختصر سوانح

(1) نام : الطاف حسین

(2) تخلص : حالؔی

(3) ولادت : 1837ء پانی پت

(4) وفات : 1914ء پانی پت

(5) مشہور تصانیف : مقدمہ شعر و شاعری، حبِّ وطن، برکھا رُت، نشاطِ امید، چپ کی داد، مناجاتِ بیوہ وغیرہ۔

الطاف حسین حالؔی کی پیدائش پانی پت (ہریانہ) کے ایک غریب خاندان میں 1837ء میں ہوئی۔ کم عمری میں ہی ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بھائی بہنوں نے ان کی کفالت کی۔ گھر والوں نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کر دی۔ اس لیے فکر معاش نے انھیں دہلی آنے پر مجبور کیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد عزیزوں کے اصرار پر پانی پت لوٹ آئے۔ حالؔی کو علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ چار پانچ سال بعد دوبارہ دہلی آئے اور یہاں رہ کر مختلف اساتذہ سے عربی، فارسی، منطق اور صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں پر ان کی ملاقات شیفتؔہ سے ہوئی۔ نواب مصطفٰی

خاں شیفتہ نے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ انھیں کے ذریعہ ان کی رسائی غالب تک ہوئی۔ حالی برابر غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ان سے فیض اٹھاتے رہے۔ **31** دسمبر **1914**ء کو پانی پت میں ان کا انتقال ہوا۔

شیفتہ کے صحبت اور غالب کی شاگردی نے حالی کے اندر سخن فہمی اور شعر گوئی کا ذوق پیدا کیا۔ وہ شیفتہ سے بہت متاثر تھے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی لاہور چلے گئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ یہاں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس کو باقاعدگی کے ساتھ حالی دیکھتے تھے۔ اس طرح انھیں کچھ انگریزی ادب سے واقفیت پیدا ہوئی۔ چنانچہ **1874** میں جب محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے کہنے پر اُس تاریخی مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرع طرح کے شاعروں کو موضوع دیا جاتا تھا۔ اس میں حالی بھی شریک ہوئے اور حب وطن، برکھا رت، نشاطِ امید وغیرہ جیسی نظمیں کہیں۔ مناجات بیوہ اور چپ کی داد بھی اُن کی معروف نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ مسدس مد و جزر اسلام لکھ کر عوام اور خواص میں مقبول ہوئے۔ اس نظم میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بڑے موثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔

حالی کی شاعری پر غالب کی چھاپ کم نظر آتی ہے، البتہ انھیں اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں لیکن شیفتہ اور سرسید کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ مبالغہ آرائی کو شیفتہ اور سرسید دونوں ہی ناپسند کرتے ہیں، سرسید سادگی پر بہت زور دیتے تھے۔ اس لیے حالی کی شاعری میں سادگی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

سرسید نے نیچرل شاعری کا جو تصور پیش کیا اس کی رو سے شعرا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ ان کی شاعری میں فرضی باتیں نہ ہوں، اصلیت ہو، کوئی بات خلاف فطرت نہ ہو۔ حالؔی نے اس تصور کی پرزور وکالت کی۔

حالؔی کی تصنیفات میں حیاتِ جاوید، یادگارِ غالبؔ، حیاتِ سعدی اور ایک اردو دیوان اہم ہیں۔ ان کی تصنیف 'مقدمۂ شعر وشاعری' پہلے اسی دیوان کا حصہ تھی۔ یہ کتاب تنقیدی نوعیت کی ہے اور اسی کتاب سے اردو ادب میں باقاعدہ تنقید نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔

غزل کی تاریخ میں حالؔی کا نام آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غزل کو جدید دور کے تقاضے سے ہم آہنگ کیا اور اس میں عصری حسیت کا رنگ بھرا۔ وہ جدید غزل کے بانی تصور کیے جاتے ہیں اور اُن سے جدید غزل کا سفر شروع ہوتا ہے۔ حالؔی کی غزل گوئی کی سب سے بڑی خوبی اُن کی زبان کی صفائی اور اُن کے اسلوب کی سادگی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ تصنع اور مبالغہ آرائی سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ وہ غالبؔ کے شاگرد بھی تھے، اس لیے انھوں نے ابتدا کلاسیکی رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

اِک عُمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھّی ہے آج لذتِ زخم جگر کہاں!

ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تُجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں!

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں

حالؔی! نشاطِ نغمہ و مَے ڈھونڈھتے ہو اب!
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں!

معنی اور اشارے:

جستجو	=	تلاش
نیشِ عشق	=	عشق کی کھٹک، نیش، ڈنک
ترک	=	چھوڑنا
نشاط	=	خوشی، مسرت
اتالیق	=	استاد
مَے	=	شراب

کثیرالجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) حالؔی کا سنہء پیدائش کیا ہے؟

(a) 1914ء　　(b) 1937ء

(c) 1837ء　　(d) 2000ء

(2) حالؔی کا وطن کہاں تھا؟

(a) پانی پت　　(b) دلی

(c) پٹنہ　　(d) لکھنؤ

(3) حالؔی نے کس کے ذریعہ غالبؔ سے ملاقات کی؟

(a) نواب شیفتہ (b) میرؔ

(c) سرسید (d) شبلیؔ

(4) ''حیاتِ جاوید'' کس کی تصنیف ہے؟

(a) سرسید (b) شبلی

(c) حالی (d) محمد حسین آزادؔ

(5) حالی کی اس مشہور کتاب کا نام بتایئے جو تنقید پر لکھی گئی ہے:

(a) مقدمہ شعروشاعری (b) حیات جاوید

(c) حیات سعدی (d) یادگارِ غالب

(6) حالؔی کی وفات کب ہوئی؟

(a) 1950ء (b) 1837ء

(c) 1914ء (d) 2020ء

(7) حالؔی کی کتاب حیاتِ جاوید کس ادیب کی سوانح عمری ہے؟

(a) غالبؔ (b) شیفتہ

(c) سرسید (d) شبلیؔ

مختصرترین سوالات (Very short type questions):

(1) حاؔلی کی کسی ایک کتاب کا نام لکھیے ؟

(2) حاؔلی کس کے بچوں کے اتالیق تھے؟

(3) مسدس مدو جزر اسلام کے مصنف کون ہیں؟

(4) حاؔلی شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟

مختصرسوالات (Short type questions):

(1) ''مقدمہ شعروشاعری'' کس طرح کی کتاب ہے؟

(2) مندجہ ذیل شعر کا مطلب لکھیے :

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

(3) سر سید کے کس تصور کی حاؔلی نے حمایت کی؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) حاؔلی کی غزل گوئی پر مختصر نوٹ لکھیے ؟

(2) حاؔلی کے کلام کی خوبیاں بیان کیجیے؟

سبق (9) شیخ محمد اقبالؔ

مختصر سوانح

(1) نام : محمد اقبال

(2) ولادت : 9 نومبر 1877ء سیالکوٹ

(3) وفات : 21 اپریل 1938ء لاہور

(4) مجموعۂ کلام : بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز

(5) خطاب : حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ''سر'' کا خطاب

اقبالؔ کے آباواجداد کشمیری سپرو برہمن تھے۔ اسلام مذہب اختیار کرنے کے بعد ان کا خاندان سیال کوٹ آ گیا۔ وہیں پر 9 نومبر 1877ء کو ان کی ولادت ہوئی۔ اقبال کو اپنے برہمن ہونے پر فخر تھا اور اس فخر کا سبب یہ ہے کہ برہمن فلسفہ و حکمت کے دلدادہ اور ماہر ہوتے ہیں۔

اقبالؔ کے والد نور محمد اور والدہ امام بی بی نیک طبیعت کے مالک تھے۔ نور محمد زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اردو اور فارسی کے مطالعہ کا شوق رکھتے تھے۔ وہ محی الدین ابن عربی سے بہت متاثر تھے اور ان کی تصانیف کا توجہ سے مطالعہ کرتے تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا شاید اسی لیے اقبالؔ کلام پاک کی تلاوت کے

بہت شوقین تھے اور بڑی خوش اخلاقی سے تلاوت کرتے تھے۔

ایک بار تلاوت کے دوران ان کے والد ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ بیٹا کلام پاک یہ سمجھ کر تلاوت کرو کہ اللہ تعالیٰ تم ہی سے مخاطب ہے اور یہ تم پر نازل ہوا ہے۔ والد کی اس نصیحت کا اثر ان کی شخصیت پر زندگی بھر قائم رہا۔

اقبآل جب چار سال چار مہینے کے تھے تو انھیں تعلیم کی غرض سے ایک مدرسہ میں بٹھا دیا گیا۔ سید میر حسن کے مشورے سے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مکتب میں اردو، فارسی اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں سے فراغت کے بعد اسکاچ مشن کالج میں داخلہ لیا۔ **1891**ء میں مڈل، **1893**ء میں میٹرک اور **1895**ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد لاہور گورنمنٹ کالج سے بی۔اے۔ اور ایم۔اے۔ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم کے دوران ان کی ملاقات فلسفے کے استاد پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی۔ پروفیسر آرنلڈ کے کہنے پر ہی انھوں نے **1905**ء میں یورپ کا سفر کیا۔ وہاں فلسفے میں مہارت حاصل کی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اس کے بعد جرمنی چلے گئے۔ جہاں میونخ یونیورسٹی سے ایرانی فلسفہ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اقبآل نے کم عمری میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی، شاعری کی دنیا میں اس وقت پورے ہندوستان میں داغؔ کی غزل گوئی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس لیے اقبآل نے داغؔ کی با قاعدہ شاگردی اختیار کی۔ داغؔ کی اصلاح نے اقبآل کے کلام میں روانی اور زباں میں صفائی پیدا کی اور جلد ہی انجمن حمایت اسلام کے بڑے بڑے جلسوں میں نظمیں پڑھنے لگے۔ جس کی بدولت ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ مولانا الطاف حسین حآلی نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ”

تصویرِ درد‘‘ کے اشعار کو پسند کر کے اقبالؔ کو انعام کے طور پر دس روپیہ کا نوٹ دیا تھا۔

اقبالؔ کی ازدواجی زندگی کھٹّی میٹھی، اتار چڑھاؤ اور نیم خوشگواری کے درمیان گزری۔ دھن کے پکّے اقبالؔ کا کسی سے مزاج نہ ملا۔ کسی کی رفاقت قدرت کو منظور نہ ہوئی۔

یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد اقبالؔ نے اورینٹل کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج میں ملازمت کی۔ اس کے بعد وکالت شروع کی، مگر اس میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ **1923**ء میں برطانوی حکومت نے ’’سر‘‘ کا خطاب دیا اور ان کے استاد میر حسن کو ’’شمس العلماءٔ‘‘ کے خطاب سے نوازا۔ آخر کار اردو شاعری کا یہ ستارہ **21** اپریل **1938**ء کو اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

اقبالؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا، لیکن ان کی نظموں کی تعداد غزلوں سے زیادہ ہے۔ ان کی تصنیفات انگریزی نثر، خطوط، فارسی نظموں وغزلوں اور اردو شاعری پر مشتمل ہیں۔ اردو میں ان کی شاعری کا سرمایہ **بانگ درا**، **بالِ جبریل**، **ضرب کلیم** اور **ارمغان حجاز** کی شکل میں موجود ہے۔

علامہ اقبالؔ نے غزلیہ شاعری میں کائنات کی وسعت اور انسانی شخصیت کے ارتقاء کے امکانات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزل فلسفیانہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے جو اردو غزل کی تاریخ میں بالکل نئے موڑ کا حکم رکھتی ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ کائنات کی اتھاہ وسعت اور اس میں زندگی کے وجود کے بارے میں جو سائنسی دریافت ہو رہے ہیں اقبال **80** یا **86** سال پہلے اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ اقبالؔ کی غزل گوئی کی مذکورۂ بالا خوبیوں کی ایک جھلک شامل نصاب غزل جو ’’بال جبریل‘‘ مطبوعہ **1935**ء سے ماخوذ ہے، میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن، تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فُغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

معنی اوراشارے:

تہی = خالی

عالم رنگ وبو = رنگ وبو والی دنیا

زمان ومکاں = زمانہ اور جگہ

قناعت = تھوڑی سی چیز پر خوش رہنا، صبر کرنا

شاہیں = ایک مشہور شکاری پرندہ جو بہت اونچا اڑتا ہے

انجمن = مجلس، محفل

کثیرالجواب پرمبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) اقبالؔ کی پیدائش کب ہوئی؟

(a) 1877ء   (b) 1977ء

(c) 1677ء   (d) 2000ء

(2) اقبالؔ کہاں پیدا ہوئے؟

(a) لاہور   (b) اسلام آباد

(c) سیال کوٹ   (d) پنجاب

(3) 'بالِ جبریل' کس شاعر کا مجموعۂ کلام ہے؟

(a) حالیؔ (b) جوشؔ

(c) فیضؔ (d) اقبالؔ

(4) پروفیسر آرنلڈ کس مضمون کے استاد تھے؟

(a) اردو (b) انگریزی

(c) فلسفہ (d) سنسکرت

(5) اقبالؔ کے والد کا نام کیا ہے؟

(a) نور محمد (b) میر حسن

(c) میر ضمیر (d) عطا محمد

(6) بانگِ درا اور ضربِ کلیم کس شاعر کا مجموعہ کلام ہے؟

(a) اقبالؔ (b) جوشؔ

(c) حالیؔ (d) فیضؔ

(7) امام بی بی کس شاعر کی والدہ تھیں؟

(a) جوشؔ (b) میرؔ

(c) اقبالؔ (d) حالیؔ

(8) اقبالؔ کی وفات کب ہوئی؟

1872 (a) 1877 (b)

1938 (b) 1950 (d)

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) اقبالؔ کے کسی ایک مجموعے کا نام لکھیے؟

(2) ''بال جبریل'' کس کا مجموعہ کلام ہے؟

(3) اقبالؔ کے والد کا نام کیا ہے؟

(4) اقبالؔ کس شہر میں پیدا ہوئے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) 'ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں' اس مصرع میں عشق کے امتحاں سے کیا مراد ہے؟

(2) شاعر نے انسان کو شاہین کیوں کہا ہے؟

(3) چمن اور آشیاں سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) اقبالؔ کی غزل گوئی کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے؟

(2) اقبالؔ کے حالات زندگی پر ایک مضمون تحریر کیجیے؟

سبق (10) حسرتؔ موہانی

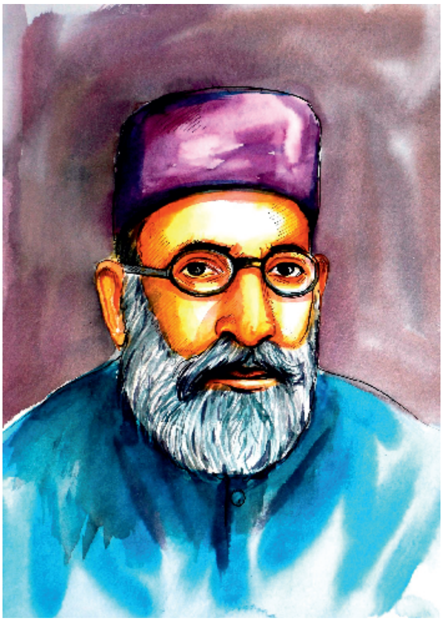

مختصر سوانح

(1) نام : سید فضل الحسن

(2) تخلّص : حسرتؔ

(4) ولادت : 1875ء اناؤ

(5) وفات : 1951ء لکھنؤ

(6) مجموعۂ کلام : رسالہ اردوئے معلیٰ، حسرت موہانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔

اصل نام سید فضل الحسن اور تخلص حسرتؔ لیکن تخلص اتنا مشہور ہو گیا کہ بہت کم لوگ ان کے اصل نام سے واقف ہیں۔ حسرتؔ قصبہ موہان ضلع اُناؤ کے ایک سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہیں پر 1875ء میں ولادت ہوئی۔ ان کا انتقال 13 مئی 1951ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ آپ کے والد کا نام سید نظیر حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ عربی کی تعلیم مولانا سید ظہور السلام فتحپوری سے اور فارسی کی تعلیم مولانا نیاز فتح پوری کے والد محمد امیر خاں سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے اور یہیں سے 1903 میں بی.اے. کا امتحان پاس کیا۔ بی.اے. کے بعد ایل.ایل.بی. میں بھی داخلہ لیا لیکن مکمل نہ کر سکے۔ گریجویشن کے بعد علی گڑھ ہی سے اردو معلیٰ نامی ایک ادبی رسالہ جاری کیا جو

عرصۂ دراز تک اردو زبان وادب کی خدمت کرتا رہا۔

حسرتؔ کو شروع سے شعر وشاعری کا شوق تھا۔ اپنا کلام تسلیم لکھنوی کو دکھانے لگے۔ وہ نسیم دہلوی کے بھی شاگرد تھے۔ مزید براں علی گڑھ کے علمی وادبی ماحول نے حسرتؔ کے شاعرانہ ذوق کو تقویت بخشی۔ تحریک آزادی میں بھی وہ عملی طور پر شامل رہے۔ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں کیا۔ سودیشی تحریک کے زبردست حامیوں میں تھے۔ انھوں نے آخری وقت تک کسی ولایتی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ایک جرأت مند سیاست داں اور بے باک صحافی تھے۔ انھوں نے اپنی سیاست اور صحافت کی وجہ سے کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور ان کے رسالے اردو معلیٰ کی ضمانت ضبط کر لی گئی لیکن ملک کی کامل آزادی کے لیے بلا خوف وخطر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور اس میں وہ کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھے۔

اردو غزل کی تاریخ میں حسرتؔ قدیم و جدید کے درمیان ایک عبوری حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کو از سرِ نو زندگی بخشی اور اسے قابلِ قبول بنانے میں اہم حصہ لیا۔ انھوں نے غزل کو سطحیت، عامیانہ پن اور سوقیانہ پن کے دائرے سے باہر نکال کر تہذیب، عاشقی کی شائستہ زبان سے آشنا کیا۔

ان کا کلام صفائی، سادگی، سلاست اور روانی کا ایک حسین مرقع ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف ستھری اور آبِ کوثر سے دھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں صنعتوں کے استعمال پر کوئی خاص توجہ نہیں ملتی۔

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

حیرت غرورِ حُسن سے، شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گدازِ میرؔ
حسرتؔ! ترے سخن پہ ہے لُطفِ سخن تمام

معنی اور اشارے:

انجمن	=	محفل
چلن	=	طریقہ، ڈھنگ
حیرت	=	تعجب
اضطراب	=	پریشانی
شیرینی	=	مٹھاس، مراد صفائیِ زبان
سوز و گداز	=	جلنے، پگھلنے کی کیفیت، رنج و غم کی کیفیت، شاعری کا ایک ایسا وصف جس سے رقت طاری ہو۔

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) حسرتؔ کا اصلی نام کیا تھا؟

(a) فیض الحسن **(b)** ضیاء الحسن

(c) فضل الحسن **(d)** قمر الحسن

(2) حسرتؔ کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) اُناّؤ (b) علی گڑھ

(c) لکھنؤ (d) کانپور

(3) حسرتؔ نے بی. اے. کا امتحان کس سنہ میں پاس کیا؟

(a) 1901ء (b) 1905ء

(c) 1903ء (d) 1907ء

(4) حسرتؔ کا انتقال کہاں ہوا؟

(a) لکھنؤ (b) اُناّؤ

(c) کانپور (d) علی گڑھ

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) حسرتؔ موہانی نے کون سا رسالہ نکالا؟

(2) حسرتؔ نے اپنی شاعری میں کس طرح کی زبان استعمال کی ہے؟

(3) شاعری میں حسرتؔ کس کے شاگرد تھے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) ''دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام'' اس مصرعے میں آتش گل سے کیا مراد ہے؟

(2) کس شعر میں تعلّی کا اظہار کیا گیا ہے اور اس سے شاعر نے کس طرح کام لیا ہے؟

(3) چشمِ یار کی جادو نگاہی سے کیا مراد ہے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) حسرتؔ کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجیے؟

(2) حسرتؔ کے کلام کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے؟

(3) حسرتؔ نے اپنی شاعری میں کس طرح کی زبان استعمال کی ہے؟

سبق (11) فانؔی بدایونی

مختصر سوانح

(1) نام : شوکت علی خاں

(2) تخلّص : فانؔی

(3) ولادت : 13 ستمبر 1879ء بدایوں (یوپی)

(4) وفات : 27 اگست 1941ء حیدر آباد

(5) مجموعۂ کلام : باقیاتِ فانی اور عرفانیات فانی

شوکت علی خاں نام اور تخلص فانؔی تھا۔ 13 ستمبر 1879ء کو قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شجاعت علی خاں پولس انسپکٹر تھے۔ فانی نے ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد بدایوں سے ہائی اسکول پاس کیا اور بریلی سے بی.اے. پاس کر کے علی گڑھ سے ایل.ایل.بی. کیا لیکن ان کو وکالت کا پیشہ پسند نہ آیا۔ طبیعت شروع سے ہی شعر وسخن کی طرف مائل تھی۔ فانؔی نے پہلی غزل 1890ء میں گیارہ سال کی عمر میں کہی۔ ان کے والد ہمیشہ شعر کہنے سے روکتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے فانؔی کا پہلا دیوان نذرِ آتش کر دیا۔ جس سے فانی کو دلی تکلیف ہوئی۔ شاعری ان کی فطرت کا حصہ تھی، اس لیے وہ اسے ترک نہ کر پائے اور پوشیدہ طور پر شعر کہتے رہے۔

فانؔی کی مطبوعہ کتابوں میں دیوان فانی، وجدانیات فانی، باقیاتِ فانی اورعرفانیات فانی کے علاوہ شیکسپیئر اور ملٹن کے ڈرامے بھی ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ قطعات و رباعیات، قصائد، سہرے وغیرہ بھی کہے ہیں لیکن ان کی شہرت ان کی غزل گوئی کے سبب ہے۔ان کی غزلوں میں معنویت اور اثرانگیزی بطورخاص پائی جاتی ہے۔ان کا کلام دل پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔

فانؔی کو **1932**ء میں کشن پرشاد نے حیدرآباد بلایا۔ دربار سے وابستہ رہنے کے ساتھ وہ ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی مقرر ہوگئے۔دکن میں جاکر بھی ان کو راحت میسر نہیں ہوئی۔ بالآخر **27** اگست **1941**ء میں **62** برس کی عمر میں حیدرآباد میں وفات پائی۔

فانؔی کا شمار اردو کے ممتاز غزل گوشعرا میں ہوتا ہے۔جدید غزل کو جن شعرا نے فکری اورفنی بنیادیں فراہم کیں ان میں فانؔی کا نام بھی بڑی عزّت سے لیا جاتا ہے۔اُن کی شاعری اعلیٰ درجے کی ہے۔احساس کی شدت، دردانگیزی اور فکر وخیال کی گہرائی وتہہ داری فانؔی کے کلام کے بنیادی اوصاف ہیں۔اُن کے یہاں حسن وعشق کے رنگین افسانے بھی ملتے ہیں اور تصوف ومعرفت کے مضامین بھی۔اُن کے اشعار میں یاس وقنوط کے عناصر کی بہتات ہے۔اُن کی غزلیں رنج وغم میں ڈوبی ہوئی ہیں اور یہ رنج وغم انھیں زندگی سے مایوس کرتے ہیں، اس لیے انھیں یاسیت کا امام بھی کہا جاتا ہے۔زبان وبیان کے لحاظ سے بھی اُن کی شاعری اعلیٰ قدروں کی حامل ہے۔

اک مُعمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

مختصر قصّہ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خُلاصہ ہے اِس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ!
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

ہر نفس عُمرِ گُزشتہ کی ہے میّت فآنیؔ!
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

معنی اوراشارے:

مُعمّا = پوشیدہ بات، پیچیدہ مسئلہ، پہیلی

پشیماں = شرمندہ، شرمسار، نادم، حسرت زدہ

حیلہ = بہانہ

کونین = (کون کی جمع) دونوں جہاں یعنی دنیا اور آخرت

نفس = سانس

دیروحرم = مندرومسجد

کثیرالجواب پرمبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) فانؔی کب پیدا ہوئے؟

(a) 1879 (b) 1840

(c) 1920 (d) 1850

(2) فانؔی کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟

(a) مدرسہ (b) مکتب

(c) کالج (d) اسکول

(3) فانیؔ نے ہائی اسکول کا امتحان کہاں سے پاس کیا؟

(a) دہلی (b) مرادآباد

(c) بدایوں (d) مچھلی شہر

(4) قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کہاں داخلہ لیا؟

(a) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (b) کانپور یونیورسٹی

(c) لکھنؤ یونیورسٹی (d) آگرہ یونیورسٹی

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) فانیؔ نے پہلی غزل کس عمر میں کہی؟

(2) فانیؔ کا پہلا دیوان کس نے نذرِ آتش کردیا؟

(3) فانیؔ کو کس نے حیدرآباد بلایا تھا؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) فانیؔ کے والد کس عہدے پر فائز تھے؟

(2) فانیؔ کو شاعری کا شوق کب سے تھا؟

(3) فانیؔ کا پورا نام کیا ہے؟

(4) فانیؔ حیدرآباد کیوں گئے؟

(5) فانیؔ کا انتقال کب ہوا؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) درج ذیل اشعار کی تشریح ضروری حوالے کے ساتھ کیجیے:

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

ہر نفس عُمرِ گُزشتہ کی ہے میّت فانؔی!
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

(2) فانؔی کی حالاتِ زندگی بیان کیجیے؟

(3) فانؔی کے کلام کی خوبیاں بیان کیجیے؟

سبق (12) اصغر گونڈوی

مختصر سوانح

(1) نام : اصغر گونڈوی

(2) تخلص : اصغؔر

(3) ولادت : 1884ء گورکھپور

(4) وفات : 1936ء الٰہ آباد (پریاگ راج)

(5) مجموعۂ کلام : سرودِ زندگی، نشاطِ روح

اصغر گونڈوی کا نام اصغر حسین اور تخلص اصغر تھا۔ ان کا اصل وطن گورکھپور تھا لیکن ان کے والد تفضّل حسین نوکری کے سلسلے میں کافی عرصہ تک گونڈہ میں رہے، اس لیے آپ گونڈوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اصغؔر 1884ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں داخل ہوگئے۔ گھریلو پریشانی کی وجہ سے اسکول چھوڑ دیا۔ لیکن ذاتی مطالعے سے اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ انگریزی، عربی اور فارسی ادب کا لطف لے سکیں۔

اصغؔر ابتدا میں اپنا کلام منشی خلیل احمد وجؔد بلگرامی کو دکھاتے رہے۔ بعد میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھلائیں۔ انھوں نے قاضی شاہ عبدالغنی سے شرفِ بیعت حاصل کی۔ ہندوستانی اکیڈمی کی

ملازمت کے سلسلے میں الٰہ آباد میں قیام رہا۔ وہ اکیڈمی کے سہ ماہی رسالے ''ہندوستانی'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔

اصغؔر کا شمار جدید غزل کے معماروں میں ہوتا ہے۔ ان کا انداز بیان منفرد ہے اور یہ چیز انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز بناتی ہے۔ ان کے اشعار میں نشاطیہ رنگ پایا جاتا ہے۔ جس میں ایک خاص قسم کا لطف ہوتا ہے۔

اصغؔر عشق کی منزلیں بغیر آہ وفغاں کے طے کر لیتے ہیں۔ اصغر کی غزل میں سوز وگداز ہے، مگر ان کے سوز وگداز میں آہ و بکا نہیں ہے۔ اصغؔر کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جذبات وخیالات کو حسن وخوبی اور سلیقہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں جس سے اُن کے کلام کی اثر انگیزی دیر تک باقی رہتی ہے۔ اصغؔر ایک متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ ان کی طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی۔ جس کے اثرات ان کے کلام میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اصغؔر کے کلام کے دو مجموعے سرودِ زندگی اور نشاطِ روح شائع ہوئے ہیں۔ نشاطِ روح ان کی ابتدائی شاعری سے بالکل الگ ہے ''نشاطِ روح'' نے اردو غزل میں نئی روح پھونکی۔ اصغؔر کے کلام میں سب سے پہلی چیز لب ولہجہ کی وہ جدّت آمیز رنگینی ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو ایک خوشگوار طریقے سے متاثر کرتی ہے۔ دوسری چیز سکون واضطراب کی آمیزش ہے جو ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ تصوف اور معرفت کے مضامین کو بھی پر کیف انداز میں نظم کرتے ہیں جس کی وجہ سے تغزل اور شعریت مجروح نہیں ہوتی ہے۔ اصغؔر کا انتقال 1936ء میں الٰہ آباد میں ہوا۔

پاتا نہیں جو لذّتِ آہِ سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے
اُن کی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلا دیا
کیا منہ دِکھاؤں گا تری برقِ نظر کو میں

اصغرؔ! مجھے جنوں نہیں لیکن یہ حال ہے
گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

معنی اور اشارے:

آہِ سحر = صبح کی آہ

جنوں = دیوانگی

خرمن ہستی = زندگی کا کھلیان، حیات

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) اصغرؔ گونڈوی کا اصل وطن کہاں تھا؟

(a) گورکھپور (b) گونڈہ

(c) الٰہ آباد (d) دہلی

(2) اصغرؔ کب پیدا ہوئے تھے؟

(a) 1884ء (b) 1890ء

(c) 1900ء (d) 1905ء

(3) اصغرؔ گونڈوی کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟

(a) مدرسہ (b) گھر

(c) اسکول (d) مکتب

(4) اصغؔر کا انتقال کب ہوا؟

(a) 1936ء (b) 1945ء

(c) 1928ء (d) 1930ء

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) اصغؔر نے اسکول کیوں چھوڑ دیا تھا؟

(2) اصغؔر کیسے انسان تھے؟

(3) الہ آباد میں انھوں نے کہاں ملازمت کی؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) اصغؔر نے اپنے ابتدائی کلام پر کس سے اصلاح لی؟

(2) اصغؔر کا شمار کس دور کے غزل گوئیوں میں ہوتا ہے؟

(3) اصغؔر کے شعری مجموعوں کے نام بتایئے۔

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) درج ذیل اشعار کی تشریح ضروری حوالے کے ساتھ کیجیے:

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

اصغرؔ! مجھے جنوں نہیں لیکن یہ حال ہے
گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

(2) اصغرؔ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے؟

(3) اصغرؔ کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے؟

(4) پہلے شعر میں شاعر نے آہ سحر کے اثر سے زیادہ ''لذتِ آہ سحر'' کی اہمیت پر زور دیا ہے، اس کی وضاحت کیجیے؟

(5) ''تیسرے شعر میں شاعر محبوب کی نظر کو جینے اور مرنے کا سبب کیوں قرار دیتا ہے؟'' وضاحت کیجیے۔

سبق (13) جگر مرادآبادی

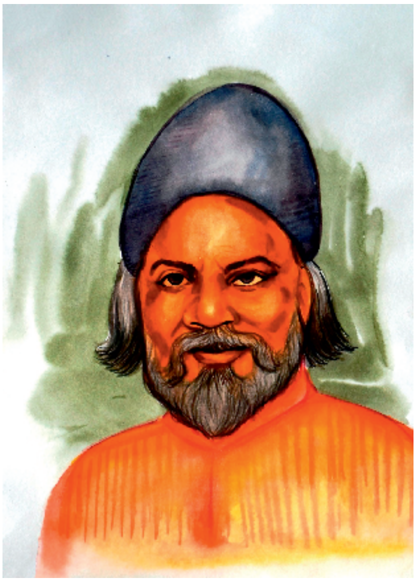

مختصر سوانح

(1) نام : علی سکندر

(2) تخلّص : جگر

(3) ولادت : 1890ء مرادآباد

(4) وفات : 9 ستمبر 1960ء گونڈہ

(5) مجموعہ کلام : داغِ جگر، شعلہ طور، آتشِ گل

جگر کا اصلی نام علی سکندر تھا۔ وہ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہ جہاں کے استاد تھے جو ترک وطن کر کے مرادآباد آ گئے تھے۔ یہیں 1890ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ جگر زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے والد مولوی نظر علی سے اصلاح لی، پھر داغؔ اور داغؔ کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔

جگر کے شعری مجموعے 'داغِ جگر'، 'شعلۂ طور' اور 'آتش گل' ہیں۔ ان میں 'آتش گل' پر ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ 9 ستمبر 1960ء کو گونڈہ میں انتقال ہو گیا۔

جگر کی شاعری ''سراپا عشق و مستی'' سے عبارت ہے۔ ہمیشہ نشۂ محبت سے سرشار رہتے تھے۔

شراب نوشی کا شغل ہمہ وقت جاری رہتا تھا۔ یہ مستی، یہ بے خودی اور یہ وارفتگی ان کے شعروں میں بھی ملتی ہے۔ وہ اکثر جھومتے ہوئے بے خودی کے عالم میں مشاعرے میں آتے اور اپنے کلام سے سامعین کو وجد میں لے آتے۔ ان کے ترنم کا خاص انداز ہوتا تھا۔ اور یہ اتنا مقبول ہوا کہ بہت سے شاعروں نے ان کے رنگ کو اختیار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ آخری ایّام میں اصغر گونڈوی کے سمجھانے پر مے نوشی ترک کر دی اور تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کے کلام میں تصوف اور رندی کے عناصر جا بجا نظر آتے ہیں۔ جگؔر نے تین شادیاں کی تھیں۔ اصغؔر گونڈوی کے مرنے کے بعد ان کی بیوی سے عقد کر لیا تھا۔ 1954ء میں انھوں نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ زبان کے معاملے میں انھوں نے اساتذہ کا رنگ اپنایا۔ مشکل فارسی الفاظ و تراکیب سے ہمیشہ گریز کیا۔ وہ آسان اور شیریں الفاظ کا انتخاب کرتے تھے۔ اس لیے ان کی زبان رواں اور دلکش نظر آتی ہے۔

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت
اپنے ہی جلوے، اپنے ہی سائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرّت
روح اگر تسکین نہ پائے

کارِ زمانہ جتنا جتنا
بنتا جائے، بگڑتا جائے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سُنے اور روح سنائے

معنی اور اشارے:

جہل	=	چیزوں کو صحیح طور پر نہ جاننا، جہالت
خِرد	=	عقل
جہلِ خرد	=	وہ عقل جو چیزوں کو صحیح طور پر سمجھ نہ پائے
مجاز	=	حقیقت کی ضد

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) جگر کا اصل نام کیا تھا؟

(a) علی اکبر (b) علی سکندر

(c) نظر محمد (d) محمد سمیع

(2) جگر کے والد کا کیا نام تھا؟

(a) خلیق (b) میر حسن

(c) مولوی علی نظر (d) اکبر علی

(3) جگر نے کتنی شادیاں کی تھیں؟

(a) دو (b) تین

(c) چار (d) ایک

(4) جگر مرادآبادی کا سنہ پیدائش کیا ہے؟

(a) 1690ء (b) 1590ء

(c) 1960ء (d) 1890ء

(5) جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

یہ کس شاعر کا شعر ہے؟

(a) جگرؔ (b) فانیؔ

(c) حسرتؔ (d) اصغرؔ

(6) جگر نے حج کی سعادت کب حاصل کی؟

(a) 1890ء (b) 1954ء

(c) 1960ء (d) 2000ء

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) ''آتشِ گل'' کس شاعر کا مجموعہ کلام ہے؟

(2) جگرؔ کا اصلی نام کیا ہے؟

(3) جگرؔ کے مورثِ اعلیٰ کا نام بتائیے۔

(4) جگرؔ کے کس مجموعہ کلام پر جگرؔ کو ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) کار زمانہ جتنا جتنا   بنتا جائے، بگڑتا جائے

اس شعر میں کار زمانہ کے بننے کو شاعر نے بگڑنا کیوں کہا ہے؟

(2) نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو

روح سنے اور روح سنائے

اس شعر میں شاعر نے نغمے کی کیا تعریف کی ہے؟

(3) صنعت تضاد کی تعریف مع مثال کیجیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) جگر مرادآبادی کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے؟

(2) جہل خرد نے دن یہ دکھائے   گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے ''گھٹنا اور بڑھنا'' میں کون سی صنعت ہے؟

(3) جگر مرادآبادی کی حالاتِ زندگی پر ایک نوٹ لکھیے؟

سبق (14) فراقؔ گورکھپوری

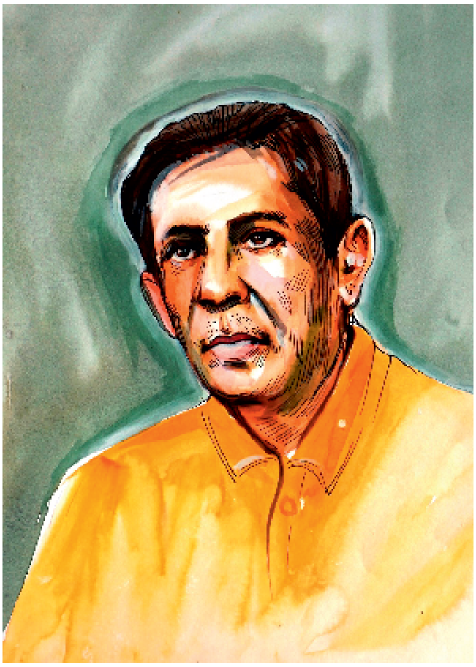

مختصر سوانح

(1) نام : رگھوپتی سہائے

(2) تخلّص : فراقؔ

(3) ولادت : 1896ء گورکھپور

(4) وفات : 1982ء دہلی

(5) مجموعۂ کلام : روحِ کائنات، رمزو کنایات، غزلستان، شبنستان، گل نغمہ، روپ

(6) اعزازات : پدم بھوشن، گیان پیٹھ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

فراقؔ گورکھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ مگر وہ فراق گورکھپوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ فراقؔ ان کا تخلص ہے۔ وہ 28 اگست 1896ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام گورکھ پرساد تھا۔ وہ پیشے سے وکیل تھے۔ فراقؔ کے والد ایک شاعر تھے اور عبرتؔ تخلص فرماتے تھے۔ فراقؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم گورکھپور میں حاصل کی۔ انٹر اور اس کے بعد کی تعلیم الٰہ آباد میں حاصل کی اور تمام امتحانوں میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ انھیں اردو، فارسی، انگریزی اور سنسکرت جیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی سرکار کی

مخالفت میں گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک سے وابستہ ہوئے اور جواہر لال نہرو کے ساتھ جیل بھی گئے۔ جیل سے رہائی کے بعد کرسچن کالج لکھنؤ میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ 1930ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں بطور لکچرر ان کا تقرر ہوا۔ 1958ء میں شعبۂ انگریزی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ 1975ء میں آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروڈیوسر بھی مقرر ہوئے اور 1982ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

فراقؔ کے شعری مجموعے 'مشعل'، 'روپ'، 'شبستان'، 'گلِ نغمہ'، 'گلِ بانگ'، 'روحِ کائنات' اور 'پچھلی رات' وغیرہ معنویت واہمیت کے حامل ہیں۔ فراقؔ کی ادبی خدمات کو ہر سطح پر سراہا گیا۔ فراقؔ کو ''گلِ نغمہ'' پر 1960ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، 1968ء میں پدم بھوشن اور 1969ء میں ملک کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ گیان پیٹھ سے نوازہ گیا۔

فراقؔ نے غزل، نظم، رباعی جیسی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی شہرت اُن کی غزل گوئی کی وجہ سے ہوئی۔ فراقؔ کی غزل میں جہاں کلاسیکی اقدار جلوہ گر ہیں، وہیں انھوں نے اپنے زمانے کے شعری تقاضوں کا بھی بطورِ خاص خیال رکھا ہے۔ اُن کی غزلوں میں زمانے کا شکوہ بھی ہے اور ذاتی دکھ درد کا بیان بھی۔ انھوں نے غزل کو اچھوتا اسلوب اور دلکش انداز عطا کیا۔ انھوں نے تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں جدّت طرازی سے کام لیا ہے۔

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کے مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گُزراں ہے کہ جو تھا
ظُلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دُھند لکے کا سماں ہے کہ جو تھا
جان دے بیٹھے تھے اِک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا
تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

معنی اور اشارے:

سنگِ نشاں	= میل کا پتھر
ظلمت	= اندھیرا
نور	= روشنی، تجلّی
دھندلکے	= اندھیرے اور اجالے کے بیچ کا وقت جب صاف دکھائی نہیں دیتا۔
سود و زیاں	= فائدہ اور نقصان
تیرہ بختی	= بدنصیبی
دلِ سوزاں	= درد سے بھرا دل، جلا ہوا دل

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions):

(1) فراقؔ گورکھپوری کا اصل نام کیا تھا؟

(a) رگھوپتی سہائے **(b)** دیا شنکر

(c) جگن ناتھ آزاد **(d)** برج نرائن

(2) فراقؔ کی ولادت کہاں ہوئی؟

(a) الٰہ آباد **(b)** کانپور

(c) گورکھپور **(d)** دہلی

(3) فراقؔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں کس زبان کے استاد تھے؟

(a) اردو (b) انگریزی

(c) ہندی (d) فارسی

(4) فراقؔ بنیادی طور پر کس صنف کے شاعر تھے؟

(a) غزل (b) نظم

(c) مرثیہ (d) قصیدہ

(5) ''روحِ کائنات'' کس کی غزلوں کا مجموعہ ہے؟

(a) فیض احمد فیضؔ (b) فراقؔ گورکھپوری

(c) علامہ اقبالؔ (d) فانیؔ بدایونی

(6) کس تصنیف کے لئے فراق کو 'گیان پیٹھ' ایوارڈ دیا گیا؟

(a) روحِ کائنات (b) گلِ نغمہ

(c) روپ (d) شعلہ

(7) فراقؔ کی وفات کب ہوئی؟

(a) 1882ء (b) 1982ء

(c) 1928ء (d) 1935ء

مختصر سوالات (Short type questions) :

(1) فراؔق گورکھپوری کے والد کا کیا نام تھا؟

(2) فراؔق گورکھپوری کی غزلوں کے دو مجموعوں کے نام لکھیے۔

(3) فراؔق کو پدم بھوشن ایوارڈ کس سن میں دیا گیا؟

(4) فراؔق گورکھپوری کی وفات کہاں ہوئی؟

(5) ''ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا'' اس مصرعے میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟

(6) ''صنعت تضاد'' کسے کہتے ہیں؟ مثال کے ساتھ واضح کیجیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) فراؔق گورکھپوری کی حالاتِ زندگی بیان کیجیے؟

(2) فراؔق گورکھپوری کے کلام کی خصوصیات مثال کے ساتھ بیان کیجیے؟

(3) مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گُزراں ہے کہ جو تھا

(ب) ظُلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دُھند لکے کا سماں ہے کہ جو تھا

(ج) جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

سبق (15) فیض احمد فیضؔ

مختصر سوانح

(1) نام : فیض احمد فیضؔ

(2) تخلّص : فیضؔ

(3) ولادت : 13 فروری 1911ء سیالکوٹ

(4) وفات : 1984ء لاہور، پاکستان

(5) مجموعۂ کلام: سرِ وادیٔ سینہ، زنداں نامہ، نقشِ فریادی، دستِ صبا وغیرہ۔

(6) اعزازات: سوویت یونین کا لینن امن ایوارڈ۔

میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد جس شاعر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ فیض احمد فیضؔ ہیں۔ ان کا اصل نام فیض احمد تھا۔ وہ 13 فروری 1911ء میں سیالکوٹ کی ایک چھوٹی سی بستی کالا قادر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام سلطان محمد خاں اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ فیض کی بیوی ایلس تھی جس سے دو بیٹیاں سلیمہ اور منیرہ پیدا ہوئیں۔

فیضؔ نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز اپنے گاؤں کی مسجد سے کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں داخلہ کرایا اور وہاں سے میٹرک کے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی،

پھر مرے **(Murray)** کالج سیالکوٹ کا رُخ کیا اور وہاں سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی.اے کیا اور یہیں سے **1932**ء میں انگریزی زبان میں ایم.اے. بھی کیا۔ اس کے علاوہ اورینٹل کالج لاہور سے عربی زبان میں بھی ایم.اے. کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد **1935**ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج امرتسر میں انگریزی و برطانوی ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ **1942**ء میں کیپٹن کی حیثیت سے فوج کی ملازمت کی۔ **1943**ء میں میجر اور **1944**ء میں لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ **1947**ء میں فوج کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔

فیضؔ کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے جہاں فوج میں ملازمت کی وہیں صحافت ادبی تحریک اور شاعری کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے انھوں نے پاکستان ٹائمز کی ادارت کا فریضہ انجام دیا۔ ترقی پسند ادبی نظریات کو فروغ دینے میں بھی انھوں نے اہم کردار نبھایا۔ ایک ترقی پسند شاعر و ادیب کی حیثیت سے اُن کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے 'نقش فریادی'، 'دست صبا'، 'زنداں نامہ'، 'دست تہہ سنگ'، 'سر وادیِ سینا'، 'شام شہر یاراں'، 'مرے دل مرے مسافر' جیسے شعری مجموعے اور 'میزان' اور 'صلیبیں میرے دریچے میں' جیسے نثری مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔

فیض ایک صاحب نظر شاعر ہیں۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی اور دونوں اصناف شعر میں اُن کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ فیض کی غزل گوئی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پرانے الفاظ کو اپنی

غزلوں میں اس طرح برتا ہے کہ اُن سے کلاسیکی رنگ تغزل کا حسن بھی قائم رہتا ہے اور نئے معانی بھی برآمد ہوتے ہیں۔ فیض کی غزلیں ترنم سے پُر ہیں اور ان میں جمالیاتی کیف بھی خاص طور سے پایا جاتا ہے اور یہی اوصاف اُن کی غزلوں کو دوسرے ترقی پسند غزل گویوں سے منفرد بناتے ہیں۔

فیضؔ ایک عہد ساز شاعر تھے اور ایک پورے عہد پر اثر انداز ہوئے۔ فیضؔ نے زمانے کو اپنی شاعری، علمی خدمات، خیالات سے متاثر کیا۔ فیض بے زبانوں کی آواز تھے۔ فیضؔ نے کل **80 - 85** غزلیں لکھیں۔ نظمیں زیادہ لکھیں، غزل میں مخصوص علامتیں استعمال کی ہیں۔ فیضؔ کی غزل میں ان کے الگ معنی ہیں۔ فیض اردو ادب کے ممتاز شعرا میں اپنا ایک ممتاز قدر رکھتے ہیں۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل! کب رات بسر ہوگی!
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گُہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

کب مہکے گی فصلِ گُل، کب بہکے گا مَے خانہ
کب صبحِ سخن ہوگی، کب شامِ نظر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معیّن ہے، تجھ کو تو خبر ہوگی

معنی اوراشارے:

سحر	=	صبح
لہو	=	خون
گہر	=	موتی
دیدہ	=	آنکھ
فصلِ گُل	=	موسمِ بہار
سخن	=	بات،کلام
واعظ	=	وعظ کرنے والا
زاہد	=	متقی، پرہیزگار
ناصح	=	نصیحت کرنے والا
بسر	=	گزر
قامت	=	قد
حشر	=	قیامت
معیّن	=	ٹھہرایا گیا، مقررّ
حشر	=	قیامت

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) فیضؔ احمد فیضؔ کہاں پیدا ہوئے؟

(a) پنجاب (d) لاہور

(c) سیالکوٹ (d) کراچی

(2) فیضؔ احمد فیضؔ کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) احمد خاں (b) سلطان محمد خاں

(c) محی الدین (d) محمود خاں

(3) ان میں فیض احمد فیضؔ کا مجموعۂ کلام کون سا ہے؟

(a) زنداں نامہ (b) سرخ سویرا

(c) بساطِ رقص (d) گلِ نغمہ

(4) ترقی پسند تحریک سے متعلق شاعر کون ہے؟

(a) میرؔ (b) فیضؔ

(c) غالبؔ (d) دردؔ

مختصرترین سوالات (Very short type questions):

(1) دستِ صبا کس کی تصنیف ہے؟

(2) فیضؔ کے سنہ پیدائش اور سنہ وفات لکھیے؟

(3) کب ٹھہرے گا درد اے دل! کب رات بسر ہوگی! شعر کو مکمل کیجیے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) فیض کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے؟

(2) فیض احمد فیضؔ کی چار تصانیف کا نام لکھیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح مع سیاق وسباق کیجیے:

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گُہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی
کب مہکے گی فصلِ گُل، کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہوگی، کب شامِ نظر ہوگی

نظم

نظم عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی موتیوں کو دھاگے میں پرونے کے ہوتے ہیں۔ ہر موزوں کلام کو نظم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نثر کے مقابل جس پیرایۂ اظہار سے کام لیا جاتا ہے، وہ نظم ہے۔ اس طرح شاعری کی تمام اقسام نظم کے زمرے میں آجاتی ہیں۔ لیکن شعری اصطلاح میں نظم سے مُراد وہ صنفِ سخن ہے جس میں کسی موضوع پر ربط و تسلسل کے ساتھ اشعار کہے جائیں اور تمام اشعار سے وحدت تاثر قائم ہو۔

اردو میں نظم کے نقوش قلی قطب شاہ کے یہاں ہی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں، اُن کے علاوہ دیگر قدیم شعرا نے بھی موضوعات کو پیش نظر رکھ کر نظمیں کہی ہیں، لیکن ان سے نظم نگاری کی علاحدہ روایت قائم نہیں ہوتی۔ اردو ادب کی تاریخ میں نظیؔر اکبرآبادی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے نظم نگاری کو بنیاد فراہم کی۔ اُن کے کلیات میں مختلف موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں اور ان نظموں میں حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کی گئی ہے، اس لیے نظیؔر اکبرآبادی کو اردو نظم نگاری کا پیش رو کہا جاتا ہے۔

اردو میں نظم نگاری کا باضابطہ آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی و ثقافتی نظام میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے۔ جس

کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوتے ہیں اور ادب کی سمت و رفتار میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور جدید شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام ہونے والے مناظموں میں جو جدید انداز کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں اُن سے نظم نگاری کی روایت کو مستحکم بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، اسمٰعیلؔ میرٹھی، درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی وغیرہ اردو نظم کے اولین معماروں میں ہیں۔ اردو نظم کو فکر و خیال کی بلندی عطا کرنے میں اقبالؔ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اردو شاعری میں انقلاب برپا کردیا، فنی اعتبار سے بھی ان کی نظمیں قابل قدر ہیں۔ اقبالؔ کے ساتھ ساتھ پنڈت برج نارائن چکبستؔ نے بھی نظم نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

ترقی پسندی کے دور میں نظم نگاری کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ فیض احمد فیضؔ، مخدوم محی الدینؔ، کیفی اعظمیؔ، جوشؔ ملیح آبادی، سردار جعفریؔ وغیرہ نے سیاسی وسماجی موضوعات پر خاصی تعداد میں نظمیں لکھیں۔ ان کے علاوہ علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، فراقؔ گورکھپوری، ن۔م۔راشدؔ، اخترؔ الایمان، عمیقؔ حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام وغیرہ نے بھی نظم نگاری کی روایت کو استحکام بخشا۔ دورِ حاضر میں بھی اس صنفِ سخن کی طرف اردو کے شعرا مائل ہیں اور اچھّی نظمیں کہہ رہے ہیں۔

اردو نظم نگاری کی روایت پر نگاہ ڈالنے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا اس صنف میں ہیئتی تجربے کرتے رہے ہیں جس کے نتیجے میں پابند نظم کے ساتھ معریٰ، آزاد اور نثری نظمیں ادب کا حصہ بنتی رہی ہیں۔ اردو نظم کا مستقبل تابناک ہے۔

سبق (16) نظیرؔ اکبرآبادی

مختصر سوانح

(1) نام : ولی محمد

(2) تخلّص : نظیرؔ

(3) ولادت : 1735ء دہلی

(4) وفات : 16 اگست 1830ء اکبرآباد (آگرہ)

(5) شعری تصانیف : روٹی نامہ، آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، برسات کی بہاریں، گلہری کا بچہ، تِل کے لڈّو وغیرہ۔

نظیرؔ کا اصل نام ولی محمد تھا اور نظیرؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد شیخ محمد فاروق دہلی کے رہنے والے تھے۔ نظیرؔ کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ علماء نے ان کا سنہ ء پیدائش 1735ء لکھا ہے اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیرؔ دہلی چھوڑ کر اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ (اکبرآباد) آ گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اپنے کلام میں آگرہ کا ذکر کرتے ہوئے اس پر فخر بھی

کرتے ہیں ۔

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے　　　مُلّا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے　　　شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

نظیر نے ابتدائی تعلیم مولوی کاظم اور مُلّا ولی سے حاصل کی۔ نظیر کا ذریعۂ معاش معلّمی تھا۔ ان میں شعر کہنے کی صلاحیت خداداد تھی۔ جب شعر کہنا شروع کیا تو کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اس لیے نظیر کو قطعی طور پر کسی دبستان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی راہ آپ نکالی، گویا وہ اپنے آپ میں ایک دبستان تھے۔ نظیر قناعت پسند انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی بادشاہوں سے وابستگی نہیں رکھی۔ نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلایا مگر نہ گئے۔ اُن کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، اس حلقہ میں ہر طرح کے اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ سماج کے ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کا میل جول تھا۔ نظیر کی آزاد زندگی نے نظیر کی شاعری کے لیے نئی شاہراہ تیار کی۔ جس طرف دوسرا کوئی اور قدم نہ بڑھا سکا۔ وہ راہ چلتے نظمیں کہتے، کبھی لوگوں کی فرمائش پر اور کبھی اپنے شاگردوں (لالہ بلاس رام کے بیٹوں) کو خوش کرنے کے لئے نظمیں لکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عوامی رنگ نمایاں ہے۔ وہ عوامی شاعر تھے اور لوگ اُنھیں ''میاں نظیر'' کے نام سے جانتے تھے۔ نظیر طبیعتاً رنگین اور آزاد مزاج تھے۔ انھیں سیر سپاٹے اور میلے ٹھیلوں، تہواروں میں بہت دلچسپی تھی۔ تیراکی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، کُشتی ہر طرح کے کھیل میں حصّہ لیتے تھے۔ چوسر پچیسی اور شطرنج کھیلنے میں ماہر تھے۔ پتنگ بازی میں بھی کمال حاصل تھا۔

نظیر نے ایک بھرپور زندگی گزاری، گرد وپیش کے ماحول کو کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ زندگی کے

ہنگاموں کوانھوں نے اپنی شاعری میں سمودیا۔ وہ اپنے وطن کی ہر چیز سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے تھے، چونکہ نظیرؔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وتمدن کے دلدادہ تھے۔اس لیے انھوں نے جو نظمیں ہندوستانی معاشرت، رسم و رواج، میلوں ٹھیلوں، تہواروں، ہندوستانی جانوروں، پرندوں اور موسموں پر لکھی ہیں۔ان میں ایک ایسا والہانہ اور فطری انداز پایا جاتا ہے جس سے ان کی حب الوطنی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ان کی زندگی اور شاعری میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے۔انھوں نے اسلام کے بعض مذہبی رہنماؤں اور صوفیوں کے ساتھ ساتھ رام چندر جی، کرشن جی اور گرونانک پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔انھوں نے غزلیں بھی کہیں لیکن اصل میں وہ نظم کے شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے کلام میں عام زبان اور روز مرّہ کی بول چال کا لہجہ استعمال کیا ہے۔ان کی شاعری کا انداز صاف، سادہ، سلیس اور بالکل فطری ہے۔ روٹی نامہ، آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، کلجگ، ہولی، دیوالی، جاڑے کی بہاریں، برسات کی بہاریں، گلہری کا بچہ، تل کے لڈّو وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

نظیرؔ نے اتنی مختلف جہتوں میں اور اتنی بڑی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں کہ ان کا شمار نظم کے بنیاد گذار شعرا میں کیا جاتا ہے۔ان کی تشبیہات خالص ہندوستانی ہیں اور ان کا موضوع عوامی زندگی ہے۔ حقیقت میں اردو کی موجودہ نیچرل شاعری اُنھیں کا فیضان ہے۔نظیرؔ نے ایک طویل عمر پائی۔ **16** اگست **1830**ء میں فالج کی وجہ سے ان کی وفات ہوئی۔

روٹی نامہ

جس جا پہ ہانڈی، چولھا، توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظُہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حُضور ہے
جتنے ہیں نور، سب میں یہی خاص نور ہے
اِس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور
آٹا نہیں ہے، چَھلنی سے چھَن چھَن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اُس کا ہے برفی و موتی چور
ہر گز کسی طرح نہ بُجھے پیٹ کا تنور
اِس آگ کو مگر یہ بُجھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامِل فقیر سے
''یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے؟''
وہ سُن کے بولا ''بابا! خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں، نہ سورج ہیں جانتے
بابا! ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئی پیٹ میں، سو قند گھُل گئے
گل زار پھولے آنکھوں میں اور عیش تُل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈُھل گئے
چودہ طبق کے، جتنے تھے، سب بھید کھُل گئے
یہ کشف، یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو، تو پھر کچھ جتن نہ ہو　　میلے کی سیر، خواہشِ باغ و چمن نہ ہو
بھوکے، غریب دل کی، خدا سے لگن نہ ہو　　سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے　　لمبے کسی کے بال ہیں، روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے　　سب کشف اور کمال ہیں، روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ، سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے ناچے پیادہ، قواعد دکھا دکھا　　اسوار ناچے، گھوڑے کو کاوا لگا لگا
گھنگرو کو باندھے پیک بھی پھرتا ہے ناچتا　　اور اِس سوا، جو غور سے دیکھا تو جا بہ جا
سو سو طرح کے ناچ دکھاتی ہیں روٹیاں

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نکوئی ہے　　نا دشمنی و دوستی، نا تُند خوئی ہے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے　　سب کوئی ہے اسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے
نوکر، نفر، غلام بناتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر　　روکھی بھی روٹی، حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہو وئے، موٹی، خمیری ہو، یا فطیر　　گیہوں جوار باجرے کی جیسی ہو نظیرؔ
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

معنی اور اشارے:

پُور پُور	=	بھرا ہوا
پیڑا	=	گندھے ہوئے آٹے کا ایک گولا، ایک قسم کی مٹھائی
آنکھوں میں گل زار پھولے	=	ہر طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی ہو۔
عیش تُل گئے	=	مزا آ گیا۔
ڈُھل گئے	=	پَڑ گئے
چودہ طبق کے بھید کھل گئے	=	زمین و آسمان کی ساری باتیں معلوم ہوگئیں
لگن	=	شوق، تعلق، دُھن
بھجن	=	وہ گیت جس میں خدا کی حمد ہو
کشف	=	غیب کی باتیں معلوم ہونا
قواعد	=	سپاہیوں کو پریڈ کرانا
اسوار	=	سوار
کاوا لگانا	=	گھوڑے کو پھیر دینا، گھمانا
پیک	=	قاصد، خط لے جانے والا
نکوئی	=	نیکی، اچّھائی
تُند خوئی	=	مزاج یا طبیعت کی تیزی

نفر	=	گھڑسوار سپاہی کا نوکر،فوجیوں میں سب سے کم درجے کا شخص
خوش آنا	=	پسند آنا، اچھی لگنا
نانِ فطیر	=	تازہ گندھے ہوئے آٹے کی روٹی (خمیری روٹی کا الٹا)
ڈوئی	=	لکڑی کا بڑا چمچہ جس سے کھانا نکالنے کا کام لیا جائے
بدی	=	برائی، بدخواہی
خمیر	=	گندھے ہوئے آٹے کو کچھ دیر تک گرمی میں رکھ کر ترش کر لیتے ہیں اس کو خمیر کہتے ہیں۔
شیر	=	دودھ

کثیرالجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) نظیر اکبرآبادی کہاں پیدا ہوئے؟

(a) دہلی میں　　(b) حیدرآباد میں

(c) اکبرآباد میں　　(d) لکھنؤ میں

(2) نظیر اکبرآبادی کا سنہء پیدائش کیا ہے؟

(a) 1732　　(b) 1730

(c) 1735　　(d) 1740

(3) نظیر اکبر آبادی کا اصلی نام کیا تھا؟

(a) غنی محمد　　(b) ولی محمد

(c) علی محمد　　(d) نور محمد

(4) نظیر اکبر آبادی بنیادی طور پر کس صنف کے شاعر تھے؟

(a) غزل　　(b) رباعی

(c) مثنوی　　(d) نظم

(5) نظیر کو کہا جاتا ہے؟

(a) درباری شاعر　　(b) عوامی شاعر

(c) مشرقی شاعر　　(d) مغربی شاعر

(6) نظیر اکبر آبادی کی نظم کا کیا نام ہے؟

(a) روٹی نامہ　　(b) مناجاتِ بیوہ

(c) گلزارِ وطن　　(d) چُپ کی داد

(7) نظیر اکبر آبادی کا انتقال کب ہوا؟

(a) 1800 میں　　(b) 1804 میں

(c) 1835 میں　　(d) 1830 میں

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) نظیرؔ اکبر آبادی نے ابتدائی تعلیم کس سے حاصل کی؟

(2) نظیرؔ اکبر آبادی کن کھیلوں میں ماہر تھے؟

(3) نظیرؔ اکبر آبادی کی نظموں کے نام لکھیے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) نظیرؔ اکبر آبادی کے کلام کی خوبیاں بیان کیجیے؟

(2) ''روٹی نامہ''، نظم کی کیا خوبی ہے؟

(2) ''چودہ طبق کے بھید کھل گئے'' سے کیا مراد ہے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) مندرجہ شعری اقتباسات کی تشریح ضروری حوالوں کے ساتھ کیجیے:

(الف)

جس جا پہ ہانڈی، چولھا، توا اور تنور ہے — خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظُہور ہے

چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حُضور ہے — جتنے ہیں نور، سب میں یہی خاص نور ہے

اِس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

(ب)

پوچھا کسی نے یہ کسی کامِل فقیر سے　　　”یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے؟“
وہ سُن کے بولا ”بابا! خدا تجھ کو خیر دے“　　　ہم تو نہ چاند سمجھیں، نہ سورج ہیں جانتے
بابا! ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

(2) نظیؔر اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے؟

(3) نظیؔر اکبرآبادی کی ادبی قدر و منزلت پر اظہارِ خیال کیجیے؟

سبق (17) مولانا الطاف حسین حالؔی

مختصر سوانح

(1) نام : الطاف حسین حالی
(2) تخلّص : حالؔی
(3) وطن : پانی پت
(4) ولادت : **1837**ء پانی پت
(5) وفات : **31** دسمبر **1914**ء پانی پت
(6) شعری تصانیف: **مسدّس مدوجزر اسلام**
(7) خطاب : شمش العلماء

حالؔی کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب کے ارتقا کو نئی جہت عطا کی۔ حالؔی سے پہلے اردو شاعری عشقیہ اور فلسفیانہ مضامین سے بھری پڑی تھی۔ لب و رخسار، گل و بلبل عاشق و معشوق، رقیب جیسی لفظیات سے اردو شاعری عبارت تھی۔ لیکن تبدیلی فطرت کا قانون ہے۔ انگریزی ادب و شاعری نے اردو ادب کو بھی خاصا متاثر کیا۔ اردو ادب میں موضوعاتی شاعری مغرب کی دین ہے۔ انجمن پنجاب لاہور کے روحِ رواں مولانا محمد حسین آزاد کی تحریک پر انجمن پنجاب نے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا جس میں مصرعِ طرح کے بجائے عنوان پر نظمیں کہی گئیں۔ اس کا مقصد اردو شاعری کو نئی سمتوں، وسعتوں، جہتوں اور معانی

سے روشناس کرانا تھا۔ 75 - 1874ء میں متعدد مشاعرے منعقد کئے گئے جن میں خاص موضوع پر شعرا نظم لکھ کر لاتے اور پیش کرتے تھے۔ حالؔی کو موضوعاتی شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ بیشتر مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی اور انسانی زندگی سے متعلق اہم موضوعات پر نظمیں پیش کیں۔ حالانکہ ابتدا میں حالؔی نے غزلیہ شاعری بھی کی، غالبؔ کی شاگردی بھی اختیار کی اور میؔر سے بھی متاثر ہوئے۔ لیکن ان کا ذہنی میلان ادب کے ذریعہ انسانی زندگی کے اخلاق و کردار کو بلند کرنے کی جانب تھا۔ انگریزی سے واقفیت نے اس جذبہ کو مستحکم کر دیا۔

برکھارت، حب وطن، نشاطِ امید، مناظرہ رحم و انصاف ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ ان کی دو اور نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی ''چپ کی داد'' جس میں انھوں نے عورتوں کی عظمت، ایثار اور قربانی کو سراہا ہے۔ دوسری نظم مناجاتِ بیوہ ہے جو کم سنی میں بیوہ ہونے والی لڑکیوں کے جذبات و کیفیات اور مسائل سے متعلق ہے۔ حالؔی عورتوں کے مختلف مسائل کو بہت دردمندی سے محسوس کرتے ہیں اور قاری کو بھی اسی درد سے روشناس کراتے ہیں۔

مولانا حالؔی نے سرسید کے ایما پر ایک طویل نظم مدوجزر اسلام تصنیف کی، جو قوم کے عروج و زوال سے متعلق ہے۔ اس میں انھوں نے قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ کو واضح کیا ہے۔ 'بے عملی'، 'کوتاہی' انتشار افتراق اور ناامیدی کو زوال کا سبب قرار دیا ہے۔ قوت و عمل پیدا کرنے کی تلقین کی ہے، امید کا درس دیا ہے اور زندگی کو بامقصد اور کارآمد بنانے کی نصیحت کی ہے۔ صالح کردار کے ذریعہ صالح معاشرہ کی تشکیل ان کی شاعری کا نچوڑ ہے۔ نظم 'دنیا' حالؔی کی مناجاتِ بیوہ سے اخذ ہے۔

دنیا

(مُناجاتِ بیوہ)

اے عزت اور عظمت والے! — رحمت اور عدالت والے!

دُکھڑا تجھ سے یہ کہنا دل کا — اک بَشَرِیَّت کا ہے تقاضا

دل پہ ہے جب برچھی کوئی چلتی — آہ، کلیجے سے ہے نکلتی

جب کوئی دکھ یاد آ جاتا ہے — جی بے ساختہ بھر آتا ہے

ورنہ ہے اِس دنیا میں دھرا کیا — خوابک کا سا اک ہے یہ تماشا

دُکھ سے ہے یہاں کے گھبرانا کیا — سُکھ پہ ہے یہاں کے اِترانا کیا

عیش کی یہاں مہلت ہے نہ غم کی — سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں — چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں

منگنی، بیاہ، برات اور رخصت — میل، ملاپ، سہاگ اور سنگت

ہیں دو دن کے سب بہلاوے — آگے چل کر ہیں پچتاوے

ریت کی سی دیوار ہے دُنیا — اُوچھے کا سا پیار ہے دُنیا

بجلی جیسی چمک ہے اِس کی
پَل دو پَل کی جھمک ہے اِس کی

آج ہے یہاں جنگل میں منگل
کل سنسان پڑا ہے جنگل

آج ہے رہنے کی تیّاری
اور کل ہے چلنے کی باری

آج ہے پانا، کل ہے کھونا
آج ہے ہنسنا، کل ہے رونا

کبھی ہے بادھا، کبھی ہے گھاٹا
کبھی ہے جوار، اور کبھی ہے بھاٹا

ہار کبھی ، اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے

ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یہاں کا
ناؤ کا سا سنجوگ ہے یہاں کا

خوشی میں غم یہاں یاں مِلا ہوا ہے
امرت میں بِس گھُلا ہُوا ہے

سیر کو جو اس باغ میں آئیں
دیکھ کے پھل کو ہاتھ لگائیں

یہاں ہر پھل اندراین کا ہے
دیکھنے سے چکھنے میں بُرا ہے

عیش جنھوں نے سدا اُڑائے
وہ بھی ہیں آخر کو پچتائے

معنی اور اشارے:

عدالت	=	انصاف ملنے کی جگہ
بے ساختہ	=	خود بہ خود
سوگ	=	دکھ، غم
سنجوگ	=	اتفاق
بَشَرِیَّت	=	آدمیّت
جوار بھاٹا	=	سمندر کے پانی کا اتار چڑھاؤ، مدوجزر
اندرائن	=	ایک بہت کڑوا پھل

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) حالؔی کس شاعر سے متاثر تھے؟

(a) آبروؔ (b) حاتمؔ

(c) آتشؔ (d) میرؔ

(2) انجمن پنجاب مشاعرے کا دور کیا تھا؟

(a) 1874 - 1875 (b) 1850 - 1851

(c) 1857 - 1858 (d) 1890 - 1891

(3) انجمن پنجاب کہاں قائم کی گئی؟

(a) دہلی (b) لاہور

(c) حیدرآباد (d) لکھنؤ

(4) مسدس مدو جزر اسلام کا موضوع کیا ہے؟

(a) تنقید کی اصلاح (b) قوم کی اصلاح

(c) زبان کی اصلاح (d) غزل کی اصلاح

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) نظم مناجاتِ بیوہ میں کس مسئلہ کو پیش کیا گیا ہے؟

(2) حالی نے مسدس مدو جزر اسلام کس کے ایما پر تصنیف کی؟

(3) حالی شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟

(4) نظم ''چپ کی داد'' کس موضوع پر لکھی گئی ہے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) ''مسدس مدو جزر اسلام'' کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیں؟

(2) انجمن پنجاب لاہور میں کس طرح کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے؟

(3) حالی کی کسی تین نظموں کے نام بتایئے؟

(4) حالی کے پہلے کس طرح کی شاعری ہوتی تھی؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) حالی کی نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے؟

سبق (18) درگا سہائے سرور جہان آبادی

مختصر سوانح

(1) نام : درگا سہائے سرور جہان آبادی

(2) تخلّص : سرورؔ

(4) ولادت : 1873ء پیلی بھیت (یوپی)

(5) وفات : 3 دسمبر 1910ء پیلی بھیت (یوپی)

(6) شعری تصانیف: جامِ سرور، خم خانۂ سرور، اکسیرِ سخن وغیرہ

درگا سہائے سرور جہان آبادی کی پیدائش 1873ء کو ضلع پیلی بھیت کے قصبہ جہان آباد میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدا میں وحشتؔ تخلص اختیار کیا۔ بعد میں سرورؔ تخلص فرمانے لگے۔ ان کے والد کا نام حکیم پیارے لال تھا۔ ان کے آبا و اجداد جہان آباد کے قدیم زمیندار تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ تحصیلی جہان آباد سے حاصل کی۔ یہیں سے مڈل کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ فارسی کی تعلیم مولوی سید کرامت حسین بہارؔ سے حاصل کی جو کہ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ انھوں نے چودہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع

کر دیا تھا۔ ابتدا میں اپنے استاد بہارؔ ہی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ سرور نے اپنی شاعری میں پختگی لانے کے لیے دہلی اور لکھنؤ کے اساتذۂ سخن کا عمیق مطالعہ کیا جن میں میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، انیسؔ اور دبیرؔ کے نام اہم ہیں۔ اپنی خداداد صلاحیت اور فطری ذہانت کی وجہ سے انھوں نے اردو اور فارسی زبانوں پر ایسا عبور حاصل کر لیا تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات کو بھی بڑی آسانی سے نظم کا لباس پہنا دیتے تھے۔

1890ء میں **17** برس کی عمر میں ان کی شادی اپنے ہی قصبے کے ایک معزز خاندان میں شنکر دیوی سے ہوئی۔ یہ خوش سلیقہ، باشعور اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کی وفات **1900**ء میں ہو گئی جس سے سرور کو کافی صدمہ پہنچا۔

سرورؔ جہاں آبادی معتبر نظم نگار شاعر تھے۔ ان کا شمار اردو نظم کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں ادیب (الٰہ آباد)، غزل (لاہور) زمانہ (کانپور) عصمت دہلی، تنویر الشرق (کلکتہ) جیسے معیاری رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ ان رسالوں میں ان کی نظموں کی اشاعت سے ان کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی۔

سرورؔ جہان آبادی نے قومی اور وطنی موضوعات پر زیادہ تر نظمیں لکھیں۔ ان کی نظموں میں حب الوطنی کا جذبہ بطور خاص موجود ہے۔ انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جن پر ان سے پہلے کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ مثلاً: پدمنی، پریاگ کا سنگم، نور جہاں کا مزار، سارس کا جوڑا، اجڑی ہوئی دلہن، سیتا جی

کی گریہ وزاری، گنگا جمنا وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جو ان کی انفرادیت ظاہر کرتی ہیں۔ سرور کو مناظر فطرت کے بیان میں مہارت حاصل تھی۔ وہ فطرت کے مختلف مناظر کو اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ڈھال دیتے ہیں۔

سرور جہان آبادی کا میلان طبع نظم کی طرف تھا۔ اس لیے انہوں نے اس صنف سخن میں خاص طور سے طبع آزمائی کی۔ غزل ان کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے دستیاب کلام میں محض چند غزلیں ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انھوں نے رباعیات بھی کہی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی تیس بتیس سے زیادہ نہیں ہے۔ ''جام سرور''، خم خانۂ سرور، خمکدۂ سرور، کے علاوہ اکسیر سخن ان کی شعری تصنیفات ہیں۔ 3 دسمبر 1910ء کو مختصر علالت کے بعد 37 سال کی عمر میں پیلی بھیت میں ان کا انتقال ہوا۔

گلزارِ وطن

پھولوں کا کنج دل کش بھارت میں اک بنائیں
حُبِّ وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں

پھولوں میں جس چمن کے ہو بوئے جاں نثاری
حُبِّ وطن کی قلمیں ہم اس چمن سے لائیں

خونِ جگر سے سینچیں ہر نخلِ آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں

ایک ایک گل میں پھونکیں روحِ شمیمِ وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں

فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنج دل کش
سارے جہاں کی جسمیں ہوں جلوہ گر فضائیں

چھایا ہو ابر رحمت کاشانۂ چمن میں
رِم جِھم برس رہی ہوں چاروں طرف گھٹائیں

مرغانِ باغ بن کر اڑتے پھریں ہوا میں
نغمے ہوں روح افزا اور دل ربا صدائیں

حب وطن کے لب پر ہو جانفزا ترانے
شاخوں پہ گیت گائیں ، پھولوں پہ چہچہائیں

چھائی ہوئی گھٹا ہو، موسم طرب فزا ہو
جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

مل مِل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

معنی اور اشارے:

کنج	=	گوشہ، کونا
نخل	=	پیڑ، درخت
اشک	=	آنسو
وحدت	=	اتحاد، ایک ہونا
شمیم	=	خوشبو
فردوس	=	جنت، بہشت
کاشانہ	=	گھر، مکان
طرب	=	خوشی، نشاط
اشجار	=	بہت سے درخت
روح افزا	=	روح کو بڑھانے والا، دل کو خوش کرنے والا

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) سرور جہان آبادی کس ضلع میں پیدا ہوئے؟

(a) پیلی بھیت **(b)** میرٹھ

(c) لکھنؤ **(d)** دہلی

(2) سرور جہان آبادی کے والد کا کیا نام تھا؟

(a) حکیم پیارے لال　　(b) حکیم دلارے لال

(c) حکیم رام سکھ لال　　(d) حکیم سکھ دیو

(3) سرور جہان آبادی نے فارسی کی تعلیم کس سے حاصل کی؟

(a) مولوی سید کرامت حسین بہارؔ　　(b) سید شجاع الدین

(c) سید غلام حسین　　(d) لیاقت حسین

(4) سرور جہان آبادی کی اہلیہ کا نام کیا تھا؟

(a) شنکر دیوی　　(b) امبا دیوی

(c) پوجا دیوی　　(d) گرجا دیوی

(5) ''اکسیر سخن'' کس کا مجموعہ کلام ہے؟

(a) سرور جہان آبادی　　(b) اختر انصاری

(c) علی سردار جعفری　　(d) کیفی اعظمی

مختصر ترین سوالات (Very Short type questions):

(1) سرور جہان آبادی کا اصل نام کیا تھا؟

(2) سرور جہان آبادی کا ابتدا میں کیا تخلص تھا؟

(3) سرور جہان آبادی کس صنف میں مشہور تھے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) سرور جہان آبادی کے شعری مجموعوں کے نام لکھیے؟

(2) سرور جہان آبادی کے سوانحی حالات پر ایک نوٹ لکھیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) سرور جہان آبادی کی نظم نگاری کی خوبیاں بیان کیجیے؟

(2) نصاب میں شامل ''گلزارِ وطن'' کا خلاصہ لکھیے؟

سبق (19) برج نرائن چکبست

مختصر سوانح

(1) نام : پنڈت برج نرائن

(2) تخلّص : چکبست

(3) ولادت : 19 جنوری 1882ء فیض آباد

(4) وفات : 12 فروری 1926ء رائے بریلی

(5) شعری تصانیف : صبح وطن (شعری مجموعہ)، مضامینِ چکبست (نثری مجموعہ)

چکبست کا پورا نام پنڈت برج نرائن چکبست تھا۔ کشمیری برہمن تھے۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا لیکن ان کی پیدائش 19 جنوری 1882ء کو فیض آباد میں ہوئی ان کے والد کا نام اُدِت نرائن چکبست تھا۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی۔ 1908ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت کے میدان میں آئے۔ اس پیشے میں انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا۔ 12 فروری 1926ء کو ایک مقدمے کی پیروی کے لیے رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ پیروی کے بعد اسٹیشن آئے اور ریل میں بیٹھے ہی تھے کہ فالج کا اثر ہو گیا اور چند ہی گھنٹوں کے بعد اسٹیشن ہی پر ان کا

انتقال ہوگیا۔

چکبستؔ کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ غالبؔ، آتشؔ، انیسؔ اور دبیرؔ نے اپنی خوبیوں سے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔لیکن میر انیسؔ کی شاعری سے وہ زیادہ متاثر ہوئے۔ چکبستؔ اردو ادب کے زبردست شاعر، محقق اور انشا پرداز مانے جاتے ہیں۔ان کے کلام میں قدیم اور جدید دونوں کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ چکبستؔ نے جدید شاعری کی طرف ملک کے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کو متوجہ کیا۔

چکبستؔ نے بھی شاعری کی شروعات غزل سے کی لیکن حبّ الوطنی کے جذبے کے تحت قومی نظمیں لکھنے لگے۔ان کی شاعری کا خاص مقصد وطن کو بیدار کرنا تھا۔ چکبستؔ کی شاعری کا ایک دوسرا دلفریب پہلو ان کی نظموں میں نظر آتا ہے، جہاں وہ ہندوستان کے مناظر فطرت کو پیش کرتے ہیں۔ مناظر قدرت کو پیش کرنے میں چکبستؔ کو کمال حاصل ہے۔ چکبستؔ کے یہاں حسن و عشق کے افسانے بہت کم ہیں۔ چکبستؔ نے اپنے احباب، بزرگوں اور قومی رہنماؤں کے مرثیے بھی لکھے۔جن میں جذبات اور سیرت کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

چکبستؔ کی زندگی میں ان کی دو کتابیں صبح وطن (شعری مجموعہ) اور مضامین چکبستؔ (نثری مجموعہ) شائع ہوئیں۔ان دونوں کتابوں سے ان کے شعری اسلوب اور نثری انداز تحریر ابھر کر سامنے آتا ہے۔

کشمیر

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق، کوہ پہ لالے کا دہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیمِ سَحری کا

وہ طائرِ کُہسار لبِ چشمۂ کُہسار
وہ سرد ہوا اور گرمِ ابرِ گہربار
وہ میوۂ خوش رنگ، وہ سرسبز چمن زار
اک آن میں صَحِّت ہو، جو برسوں کا ہو بیمار
یہ باغِ وطن، روکشِ گلزارِ جِناں ہے
سرمایۂ نازِ چمن آرائے جہاں ہے

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گزرا ہے زمانہ
تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانہ
عالم نے شَرف جن کی بزرگی کا ہے مانا
اُٹھّے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا

تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انھیں کا

معنی اور اشارے:

گہر بار	=	موتی برسانے والا
روکشِ گلزارِ جناں	=	جنتوں کے باغ کی طرح
سرمایہ	=	دولت
چمن آرائے جہاں	=	دنیا کے باغ کو آراستہ کرنے والا مراد ہے خدا سے
شرف	=	بزرگی
لبِ چشمہ	=	چشمے کے کنارے
کہسار	=	پہاڑ، پہاڑی سلسلہ
طائر	=	پرندہ

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) چکبستؔ کب پیدا ہوئے؟

(a) 1882ء (b) 1890ء

(c) 1920ء (d) 1918ء

(2) چکبستؔ کے بزگووں کا وطن کہاں تھا؟

(a) آگرہ (b) دہلی

(c) لکھنؤ (d) علی گڑھ

(3) چکبستؔ نے قانون کی ڈگری کب حاصل کی؟

(a) 1980ء (b) 1905ء

(c) 1900ء (d) 1914ء

(4) چکبستؔ نے وکالت کہاں کی؟

(a) دہلی (b) الٰہ آباد

(c) لکھنؤ (d) میرٹھ

(5) چکبستؔ کا انتقال کہاں ہوا؟

(a) لکھنؤ میں (b) رائے بریلی اسٹیشن پر

(c) کانپور میں (d) آگرہ میں

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) چکبستؔ کی ولادت کہاں ہوئی؟

(2) چکبستؔ کا شمار کیسے وکیلوں میں ہوتا تھا؟

(3) چکبستؔ کیسے شاعر تھے؟

(4) چکبستؔ نے شاعری کی شروعات کس صنف سے کی؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) چکبستؔ نے حب الوطنی کے جذبے سے ماموروکون سی نظمیں لکھیں؟

(2) چکبستؔ کس کے اسلوب شاعری سے زیادہ متاثر تھے؟

(3) چکبستؔ کے کلام کی خوبیاں بتائیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) چکبستؔ کے ان اشعار کی تشریح ضروری حوالوں کے ساتھ کیجیے:

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گزرا ہے زمانہ
تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانہ
عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہے مانہ
اُٹھتے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانہ

تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انھیں کا

(2) چکبستؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

(3) چکبستؔ کے حالات زندگی پر ایک مضمون لکھیے۔

سبق (20) شیخ محمد اقبؔال

مختصر سوانح

(1) نام : شیخ محمد اقبال

(2) تخلّص : اقبؔال

(4) ولادت : 9 نومبر 1877ء سیالکوٹ

(5) وفات : 21 اپریل 1938ء لاہور

(6) شعری تصانیف: بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز وغیرہ

اصل نام محمد اقبال تھا۔ اقبؔال ہی تخلص فرماتے تھے۔ ان کی پیدائش 9 نومبر 1877ء کو شہر سیالکوٹ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام نور محمد تھا جو بڑے نیک اور دین دار شخص تھے۔ اقبال کے جدامجد بابا کول کشمیر کے سپرو برہمن تھے جو بابا نصیرالدین کے مرید تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

اقبؔال کی ابتدائی تعلیم مولوی غلام حسین کے مدرسہ میں ہوئی۔ اس کے بعد مولانا سید میر حسن کے مدرسے میں داخل ہوگئے۔ جب مولانا میر حسن اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں استاد مقرر ہوئے تو اقبؔال کا داخلہ بھی وہاں کرادیا گیا، جہاں سے انھوں نے 1892ء میں مڈل اور 1893ء میں ہائی اسکول کے امتحانات پاس کیے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ لاہور چلے گئے جہاں گورنمنٹ کالج سے عربی میں

بی۔اے اور فلسفہ میں ایم۔اے کی اسناد حاصل کیں۔ **1899**ء میں انھیں اورینٹل کالج لاہور میں بطور میکلوڈ عربک ریڈر مقرر کیا گیا۔ **1903**ء میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کا تقرر رہا۔ **1905**ء میں وہ لندن پہنچے اور وہاں کی ٹرینٹی کالج (کیمبرج یونیورسٹی) میں داخلہ لیا۔ پھر جرمنی چلے گئے جہاں کے میونخ یونیورسٹی سے فلسفے میں پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری حاصل کی۔ یکم جنوری **1923**ء کو انھیں سر کا خطاب ملا۔ **21** اپریل **1938**ء میں ان کا انتقال ہوا اور شاہی مسجد لاہور کے قریب دفن کیے گئے۔

اقبؔال اردو شاعری میں فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی کلام پر انھیں سے اصلاح لی اور اس کا اعتراف وہ زندگی بھر کرتے رہے۔ ان کے شروع کے کلام پر داؔغ کے اثرات نمایاں ہیں لیکن اقبؔال نے جلد ہی اپنے لیے الگ روش نکال لی۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے وافر تعداد میں نظمیں کہیں۔ ان کی نظمیں فکر وفن کے اعتبار سے اردو شاعری میں جداگانہ حیثیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جہاں اسلامی اقدار حیات اور افکار و خیالات کو جگہ دی، وہیں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور حب الوطن کے جذبے کو اپنی شاعری کا خاص موضوع بنایا۔ تصویرِ درد، شعاعِ امید، ترانۂ ہندی جیسی نظمیں ان کی حب الوطنی پر دلالت کرتی ہیں۔ اقبال وسیع المشرب اور روادار شخص تھے۔ انھوں نے تمام مذاہب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ سوامی رام تیرتھ، گرونانک اور رام جیسی نظمیں ان کی مذہبی رواداری کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

اقبؔال نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ ان کے اردو مجموعے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز اور فارسی مجموعے اسرار خودی، رموزِ بیخودی، زبور عجم اور پیام مشرق ہیں۔

رام

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطّۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں مَلک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

معنی اوراشارے:

وافر	=	کثیر تعداد، زیادہ
لبریز	=	بھرا ہوا، لبالب، معمور، چھلکتا ہوا
خطّہ	=	علاقہ
رفعت	=	بلندی
بام	=	چھت
فکرِ فلک رس	=	آسمان تک پہنچے والی فکر
ملک	=	فرشتہ
سرشت	=	خصلت
روشن تر از سحر	=	صبح سے بھی زیادہ روشن
اعجاز	=	معجزہ، کرامت
شجاعت	=	بہادری، دلیری

کثیرالجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) نظم 'رام' کے شاعر کون ہیں؟

(a) فیضؔ (b) حالیؔ

(c) اقبالؔ (d) جوشؔ

(2) لفظ 'ملک' کے کیا معنی ہیں؟

(a) انسان (b) جانور

(c) بچہ (d) فرشتہ

(3) اقبالؔ کا پورا نام کیا تھا؟

(a) محمد اقبالؔ (b) اقبالؔ احمد

(c) اقبالؔ (d) ڈاکٹر اقبالؔ

(4) اقبالؔ کب پیدا ہوئے؟

(a) 9 نومبر 1877ء (b) 9 دسمبر 1870ء

(c) 10 جنوری 1871ء (d) 11 نومبر 1872ء

مختصر ترین سوالات (Very Short type questions):

(1) علامہ اقبالؔ کی دو نظموں کے نام لکھیے۔

(2) علامہ اقبالؔ کا سنہ وفات کیا ہے؟

(3) بانگِ درا کس کے مجموعے کا نام ہے؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) اقبالؔ کے دو فارسی مجموعے کا نام لکھیے۔

(2) اقبالؔ کو سر کا خطاب کب ملا؟

(3) اقبالؔ شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) مندرجہ ذیل اشعار کا مطلب اپنی آسان زبان میں سیاق وسباق کے ساتھ لکھیے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

(2) اقبالؔ کی زندگی پر روشنی ڈالیے۔

(3) اقبالؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سبق (21) جوش ملیح آبادی

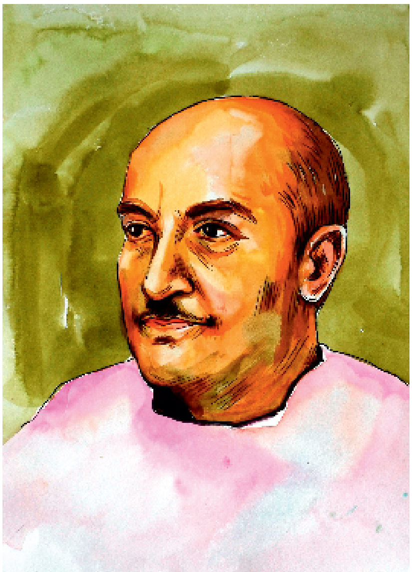

مختصر سوانح

(1) نام : شبّیر حسن خاں

(2) تخلص : جوشؔ

(4) ولادت : 1894ء ملیح آباد

(5) وفات : 22 فروری 1982ء اسلام آباد

(6) شعری تصانیف: روحِ ادب، شعلۂ شبنم، حرف و حکایت، فکرونشاط، عرش وفرش وغیرہ

شبیر حسن خاں نام تھا۔ پہلے شبیرؔ تخلص استعمال کرتے تھے۔ بعد میں جوشؔ تخلص اختیار کیا۔ 1894ء میں ملیح آباد کے محلّہ مزار گنج میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بشیر احمد خاں، دادا محمد احمد خاں، پردادا فقیر محمد خاں گویاؔ شاعر تھے۔ جوشؔ کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کا گھرانہ جاگیرداروں کے خاندان سے تھا۔ جوشؔ نسلاً آفریدی پٹھان تھے۔ خاندان میں عرصہ سے علمی وادبی مذاق کارفرما تھا۔ اس لیے جوشؔ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ وہیں انھوں نے عربی و فارسی کی ضروری استعداد بہم پہنچائی اور ذاتی مطالعہ سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ پھر انھوں نے لکھنؤ، سیتا پور، آگرہ اور علی گڑھ کے اسکولوں میں سینیر کیمبرج تک

تعلیم حاصل کی۔ 1916ء میں والد کے انتقال کے سبب تعلیم نامکمل رہ گئی۔عزیز داروں کے غیر ہمدردانہ سلوک نے انھیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ 1921ء میں انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا۔ یہاں رابندر ناتھ ٹیگور سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ ٹیگور کی شخصیت اور شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ ٹیگور کے اثر سے ان میں شعر و شاعری کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ان کی ابتدائی شاعری میں ان کے اثرات کے واضح نقوش ہیں۔تلاش معاش میں وہ 1924ء میں حیدر آباد گئے جہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ناظرِ ادب کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ وہاں بھی وہ ٹھہرے نہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی چھوڑ کر دہلی چلے آئے، یہاں انھوں نے اپنے کئی شعری مجموعے شائع کیے اور ایک رسالہ ''کلیم'' بھی نکالا۔ آزادیِ ملک کے بعد وہ سرکاری رسالہ ''آج کل'' کے مدیرِ اعلیٰ ہو گئے۔آل انڈیا ریڈیو سے بھی ان کا تعلق رہا۔ حکومت ہند نے انھیں ''پدم بھوشن'' کا اعزاز عطا کیا۔ 1956ء میں وہ پاکستان چلے گئے اور ترقی اردو بورڈ کراچی میں اردو لغت کی ترتیب کے کام سے وابستہ ہو گئے۔ وہیں 22 فروری 1982ء میں وفات پائی۔

تقسیم ہند سے پہلے کی اردو نظم نگاری میں اقبالؔ کے بعد جوشؔ ملیح آبادی کی آواز سب سے زیادہ جاندار، پر جوش، اثر انگیز اور مقبولِ خاص و عام تھی۔ اپنی اس آواز سے جس میں شباب کا جوش بھی تھا اور انقلاب کا ولولہ بھی، انھوں نے شعرا کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ جوشؔ نے نظمیں بھی لکھی ہیں غزلیں اور رباعیاں بھی، لیکن ان کا اصل سرمایہ ان کی نظمیں ہیں، جن میں رومانی، اخلاقی اور سیاسی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کی حمایت میں نظمیں لکھیں تو انھیں ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اور

انھیں ’’شاعرانقلاب‘‘ کا لقب ملا۔اس حقیقت سے انکارنہیں کیا جا سکتا کہ ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اورتحریک آزادی کوفروغ دینے میں جوشؔ کی نظموں نے اہم رول ادا کیا۔مزدور پیشہ کی حمایت، سرمایہ داری کی مخالفت، ان کا خاص موضوع ہے۔ بے باکی اور زوران کے کلام کی جان ہے۔انھوں نے معاشرے کے پسماندہ طبقہ کی کیفیت کونہایت موثر انداز میں بیان کیا ہےاور یہ بتایا کہ ہرانسان برابر ہے۔ ہرایک کی اصلاح کرنا وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ان کی نظموں میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

شاعرانقلاب کے علاوہ جوشؔ کی ایک حیثیت شاعرفطرت کی ہے۔مناظر قدرت میں جوشؔ کے لیے بے حد کشش ہے۔ وہ ان کی ایسی جیتی جاگتی تصویر کھینچتے ہیں کہ میر انیسؔ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ان نظموں میں طرزِ ادا کی جدت بھی ہےاور خیالات کی گہرائی بھی۔

جوشؔ کے کلام کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جوشؔ کا پہلا مجموعۂ کلام ’’روح ادب‘‘ **1912**ء میں شائع ہوا۔اس کے بعدکم وبیش ایک درجن مجموعے منظرِ عام پرآ چکے ہیں۔جن میں ’’شعلہ و شبنم‘‘، حرف و حکایت‘‘، ’’جنوں و حکمت‘‘، ’’سنبل وسلاسل‘‘، ’’آیات ونغمات‘‘، ’’فکر ونشاط‘‘، ’’عرش وفرش‘‘ وغیرہ ہیں۔ان کی خودنوشت سوانح ’’یادوں کی برات‘‘ اپنے دلچسپ واقعات اوردلکش اندازِ بیان کے سبب خاصی بحث انگیز اور ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔جوشؔ اوّل وآخرشاعر ہیں اوراسی حیثیت سے مشہور بھی ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ، کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟

دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے، جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظُلمِ بے پناہ؟
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمھیں جلیان والا باغ بھی؟

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا، وہ پھندا یاد ہے؟

آج کشتی امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟

ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے

خیر، اے سوداگرو! اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں

اک کہانی وقت لکھّے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے ، اب فرمان ٹل سکتا نہیں

معنی اور اشارے:

دہر	= دنیا، وقت، زمانہ
پئے امن وبقا	= امن اور زندگی کی سلامتی کے لیے
حیراں	= حیرت زدہ، ہکا بکا، دنگ، متعجب
واقف	= جان پہچان والا، آگاہ، ماہر، تجربہ کار
بے نہایت	= حد سے زیادہ
دست کار	= ہنرمند، کاریگر، وہ شخص جس کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہو
صنعت	= کاریگری، ہنرمندی
ہجرت	= اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانا
ناشاد	= رنجیدہ، غمگین، بدقسمت
درسِ حق	= سچّائی کا سبق
رُخ	= طرف، سمت، رخسار، گال
فرمان	= شاہی حکم، حکم نامہ

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) جوشؔ کب پیدا ہوئے؟

(a) 1898ء (b) 1846ء

(c) 1874ء (d) 1884ء

(2) جوشؔ کا پورا نام کیا تھا؟

(a) اکبر حسین (b) شبیر حسن خاں

(c) علی حسن (d) کاظم علی

(3) جوشؔ نے ابتدائی تعلیم کس سے حاصل کی؟

(a) گھر پر (b) مدرسہ سے

(c) مولوی سے (d) اسکول سے

(4) جوشؔ نے کلکتہ کا سفر کب کیا؟

(a) 1920ء (b) 1921ء

(c) 1923ء (d) 1925ء

(5) جوشؔ کس کی شخصیت اور شاعری سے متاثر ہوئے؟

(a) ٹیگور سے (b) حالی سے

(c) سرسید سے (d) محمد حسین آزاد سے

(6) جوشؔ نے کون سا رسالہ شائع کیا؟

(a) تہذیب الاخلاق (b) نیا دور

(c) کلیم (d) انقلاب

(7) جوشؔ کے پہلے مجموعۂ کلام کا کیا نام ہے؟

(a) یادیں (b) سرخ سویرا

(c) ایک خواب اور (d) روحِ ادب

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) ''شعلہ و شبنم'' کس کی نظم ہے؟

(2) عثمانیہ یونیورسٹی کہاں ہے؟

(3) حکومتِ ہند نے جوشؔ کو کون سا اعزاز بخشا؟

مختصر سوالات (Short type questions):

(1) جوشؔ کے کلام کی خوبیاں بیان کیجیے؟

(2) نظم میں ''سوداگر'' لفظ جوشؔ نے کس کے لیے استعمال کیا ہے؟

(3) جوشؔ کے شعری مجموعوں کے نام لکھیے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح ضروری حوالوں کے ساتھ کیجیے۔

(الف)

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو!
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا
سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

(ب)

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا، وہ پھندا یاد ہے؟
آج کشتی امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے

(2) جوشؔ ملیح آبادی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

(3) جوشؔ ملیح آبادی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

سبق (22) اخترالایمان

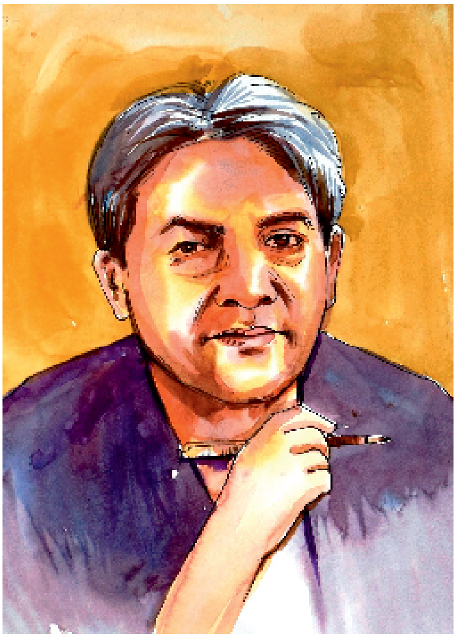

مختصر سوانح

(1) نام : اخترالایمان

(2) تخلّص : اختؔر

(3) وطن : بجنور(یوپی)

(4) ولادت : 12 نومبر 1915ء نجیب آباد

(5) وفات : 9 مارچ 1996ء ممبئی

(6) شعری تصانیف: گرداب، تاریک، سیارہ، آبِ جو، یادیں، بنت لمحات وغیرہ

اخترالایمان کی پیدائش 12 نومبر 1915ء میں نجیب آباد ضلع بجنور صوبہ اتر پردیش میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی فتح محمد مسجد کے پیش امام تھے۔ اخترالایمان نے ابتدا میں عربی، فارسی، اردو کی تعلیم حاصل کی۔ ان کا بچپن بڑی تنگ حالی میں گزرا۔ ان کے والد نے 1930ء میں ان کا داخلہ دہلی کے ایک ریفارمیٹری اسکول مؤیدالاسلام میں کروادیا۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ دور تھا۔ اسی دور نے ان کی شخصیت کو مضبوط بنایا اور اسی دور میں وہ شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ پہلے وہ غزلیں کہتے تھے بعد میں نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اخترالایمان 1934ء میں علی گڑھ گئے اور ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا۔ لیکن مالی دشواریوں کے سبب تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ شالیمار پکچرس کے مالک ڈبلیو زیڈ احمد کے ذریعہ

ان کو ملازمت ملی، انھوں نے فلم ''غلامی'' کے مکالمے اور گانے لکھے۔ آخر کار **1994**ء میں وہ ممبئی چلے گئے۔ انھوں نے فلمی دنیا اور شاعری کی دنیا میں ایک فرق تاحیات رکھا۔ اخترالایمان نے **9**/ مارچ **1996**ء کو ممبئی میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔

ان کے اہم شعری مجموعوں میں گرداب، تاریک سیارہ، آب جو، یادیں، بنت لمحات، نیا آہنگ، وغیرہ ہیں۔ ''سب رنگ'' ان کا منظوم ڈرامہ اور خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' ہے۔

اخترالایمان نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک فلسفیانہ تجسس کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کی تمام نظمیں ہیئت کے اعتبار سے آزاد یا معریٰ ہیں۔ انھوں نے حقیقت کی دنیا ہی میں رومان کی تلاش کی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں زندگی کے سخت اور کھردرے موضوعات نظر آتے ہیں۔ ان کا اندازِ فکر انوکھا ہے۔ نیکی اور بدی کی کش مکش، خواب اور حقیقت کا تصادم، انسانی رشتوں کی دھوپ چھاؤں، زندگی کے نشیب و فراز ان کی نظموں میں نئی جدّت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

اخترالایمان کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے روایتی عناصر سے خود کو دور رکھا۔ اخترالایمان کی زبان و بیان میں ایک کھردراپن ہے جو بظاہر ایک غیر شاعرانہ انداز محسوس ہوتا ہے لیکن یہ ان کے طرزِ بیان کو انفرادیت بخشتا ہے۔ ان کی زبان میں علامتوں، استعاروں کی پیچیدگی نہیں ہے۔ انھوں نے عام گفتگو کی زبان کو ادبی پیرایہ دیا ہے۔ ان کا خود کلامی و مکالمے کا انداز قاری کو متاثر کرتا ہے۔

قبر

عجم کے شہروں میں اک شہر کا ہے یہ قصّہ
یہ رفت و بود کا اک سلسلہ جو قائم ہے
بھنور میں جس کے ہر اک چیز ڈوب جاتی ہے
سنا ہے اس میں کسی قصبے کا رئیس بڑا
پھنسا کچھ ایسا، کوئی چال کارگر نہ ہوئی
ہر ایک طبّی مدد ، ہر دوا ، علاج ، غرض
وہ سب جو قبضۂ انسان و ممکنات میں تھا
کیا، تمام مسیحا قریب و دور جو تھے
طلب کیے گئے، سب کو زرِ کثیر دیا
مگر خدا کو جو منظور تھا وہ ہو کے رہا
اجل نے بیٹے سے محبوب باپ چھین لیا
خبر یہ پھیل گئی دور، پاس پل بھر میں

ہر ایک روتا تھا زار و قطار سن سن کر
پِسر کے بین کا دل پر اثر شدید ہوا
وہ سینہ پیٹ کے کہتا تھا بار بار ''پدر!
چلے ہو ایسی جگہ چھوڑ کر ہمیں سب کو
جہاں نہ دوست ، نہ ہمدم ، نہ کوئی مونس ہے
اندھیری کوٹھری ہوگی اکیلے رہنا ہے
نہ کھانا پانی جہاں ہے ، نہ روشنی کا گزر
وہاں پہ جیسے بھی گزرے گی خود ہی سہنا ہے
ہر ایک چیز کو ترسوگے ہائے ہائے وہاں
کوئی مدد کو نہ آئے گا، ایسی دنیا ہے''
غریب بھی کوئی شامل تھا اُس جنازے میں
اور اپنے نورِ نظر کو بھی ساتھ لایا تھا
سنی جو آہ و بکا اس نے کچھ نہیں سمجھا
پلٹ کے باپ سے پوچھا بہت ہی سادگی سے
ہمارے گھر لیے جاتے ہیں کیا انھیں بابا؟

معنی اور اشارے:

عجم	= عرب کے سوا کوئی ملک، عام طور پر ایران کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
رفت و بود	= آنا جانا، مراد زندگی اور موت سے ہے۔
طبّی مدد	= علاج
ممکنات	= ممکن کی جمع، جن کا ہونا ممکن ہو
زرِ کثیر	= بڑی رقم
اجل	= موت
پسر	= بیٹا
نورِ نظر	= بہت عزیز۔ مراد بیٹا
آہ و بکا	= رونا پیٹنا

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) نظم 'قبر' کس کی ہے؟

(a) میراجیؔ **(b)** مخدومؔ

(c) اخترؔ الایمان **(d)** علی سردار جعفریؔ

(2) اخترؔ الایمان کب پیدا ہوئے؟

(a) 1912ء **(b)** 1915ء

(c) 1920ء **(d)** 1925ء

(3) 'بنت لمحات' کس کی تخلیق ہے؟

(a) فیضؔ (b) مخدومؔ

(c) جذبیؔ (d) اخترؔ الایمان

(4) نظم ''یادیں'' کے شاعر کا کیا نام ہے؟

(a) مخدومؔ (b) اخترؔ الایمان

(c) علی سردار جعفریؔ (d) میراجیؔ

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) نظم 'قبر' میں کون آہ و بکا کر رہا تھا؟

(2) نظم 'قبر' میں غریب کے بچّے نے آخر میں کیا جملہ کہا؟

(3) زرِ کثیر خرچ کرنے پر بھی کس چیز کو خریدا نہیں جا سکتا ہے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) نظم ''قبر'' نے آپ کے اوپر کیا تاثر قائم کیا؟ اپنی زبان میں لکھیے؟

(2) اخترؔ الایمان کے حالات زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے؟

سبق (23) علی سردار جعفریؔ

مختصر سوانح

(1) نام : علی سردار جعفری
(2) تخلّص : جعفریؔ
(4) ولادت : 29 نومبر 1913ء گونڈہ (یوپی)
(5) وفات : 1 اگست 2000ء ممبئی
(6) شعری تصانیف: پرواز، نئی دنیا کوسلام، خون کی لکیر، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب، لہو پکارتا ہے وغیرہ۔

علی سردار جعفریؔ ترقی پسند فکر ونظر کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش 29 نومبر 1913ء کو بلرامپور ضلع گونڈہ میں ہوئی۔ ان کے والد سید جعفر ریاست بلرامپور کے اسلحہ خانے اور توشہ خانے کے افسر تھے، والدہ کا نام زاہدہ خاتون جعفری تھا۔ تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ مذہب واخلاق کے ساتھ عقائد وفقہ کے درس کے لیے اتالیق تقرر کئے گے۔ ان کے والد انھیں مذہبی عالم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آٹھ برس کی عمر میں انھیں سلطان المدارس لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ لیکن وہاں ان کا دل نہ لگا اور بلرامپور واپس آگئے۔ والد کے دریافت

کرنے پر جعفری نے انگریزی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ **1933**ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔اس سے پہلے کہ بی.اے.کی ڈگری ملتی، انگریزوں کے خلاف تقریر کرنے کے الزام میں یونیورسٹی سے نکال دیے گئے ۔اس کے بعد اینگلو عربک کالج دہلی گئے اور وہاں سے بی.اے.مکمل کیا۔

جعفریؔ نے پندرہ سولہ برس کی عمر ہی میں مرثیہ گوئی پر طبع آزمائی شروع کر دی تھی، اس کے علاوہ کالج کی میگزین میں بھی ان کے افسانے اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔

علی سردار جعفری نے ترقی پسند نظریات کو اپنی شاعری اور نثر کا موضوع بنایا۔وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے بلکہ ادب برائے زندگی کے حامی اور مبلغ تھے۔ عام انسان کا دکھ، درد، مزدور و مظلوم اور کسانوں کے مصائب و مسائل کے بیان سے ان کی شاعری عبارت ہے۔ پرواز، نئی دنیا کو سلام، خون کی لکیر، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، لہو پکارتا ہے وغیرہ ان کے اہم شعری مجموعے ہیں۔ ’’نیا ادب‘‘ اور گفتگو ان کی ادارت میں شائع ہونے والے اہم رسالے ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں **1997**ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یکم اگست **2000**ء کو ممبئی میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔

مشرق و مغرب

ایشیا والے سے، یورپ کی زمیں! کھنچ کے نہ مل
میری سوغات بھی دل ہے، تری سوغات بھی دل

جس نے لوٹا ہے ہمیں، جس نے ستم ڈھایا ہے
ارضِ مغرب نہیں، مغرب کا وہ سرمایہ ہے

اور سرمایہ نہ ہندی ہے نہ برطانی ہے
یہ مرے اور ترے خون کی ارزانی ہے

جنگلوں میں وہی آوارہ ہوا گاتی ہے
کسی بھٹکے ہوئے رہ رو کی صدا آتی ہے

کلیاں کھلتی ہیں سنورتے ہوئے گیسو کے لیے
تتلیاں اڑتی ہیں بکھری ہوئی خوشبو کے لیے

پریاں موسم کی ہواؤں میں مچل جاتی ہیں
رُت بدلتے ہی، قبائیں بھی بدل جاتی ہیں

راستے دوڑ کے اسکولوں میں مل جاتے ہیں
بچّے پھولوں کی طرح گھاس میں کھل جاتے ہیں

یاں بھی جو آنکھ ہے، عالم کی تماشائی ہے
ہر نظر لذّتِ دیدار کی شیدائی ہے

خیر ہو پیرس و لندن کے ہنر داروں کی
خیر ہو روم کے، یونان کے بت کاروں کی

تیرے بازار میں یوسف بھی ، زلیخائیں بھی
تیرے ویرانوں میں مجنوں بھی ہیں لَیلائیں بھی

زور افلاس کا، دولت کی فراوانی بھی
یاں قبا پوشی بھی ہے، چاک گریبانی بھی

حرفِ حق بھی ہے یہاں اور رسن و دار بھی
لذتِ شوق بھی ہے، جرأتِ کردار بھی

ہم حقیقت سے کبھی دور جو ہو جاتے ہیں
کچھ مظاہر کے طلسمات میں کھو جاتے ہیں

زہر سا نفرت و نخوت کا پیا کرتے ہیں
یوں ہی انسانوں کو تقسیم کیا کرتے ہیں

اصلیت نکہتِ گل کی نہیں گل دانوں سے
مے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے

بوئے گل ایک سی ہے، بوئے وفا ایک سی ہے
میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

معنی اور اشارے:

ارض	= زمین
ارزانی	= سستا ہونا
قبائیں	= قبا کی جمع، لباس
عالم	= دنیا
افلاس	= تنگ دستی
رسن و دار	= پھانسی کا پھندا
نکہت	= خوشبو
نخوت	= گھمنڈ

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) علی سردار جعفری کہاں پیدا ہوئے؟

(a) رام پور (b) بلرام پور

(c) لکھنؤ (d) پٹنہ

(2) علی سردار جعفری نے بی۔اے کہاں سے مکمل کیا؟

(a) علی گڑھ یونیورسٹی (b) الہ آباد یونیورسٹی

(c) اینگلو عربک کالج (d) دہلی کالج

(3) علی سردار جعفری مذہبی تعلیم کے لیے کہاں بھیجے گئے؟

(a) ندوہ لکھنؤ (b) سلطان المدارس لکھنؤ

(c) دیوبند سہارنپور (d) کہیں نہیں

(4) علی سردار جعفری کو کون سا ایوارڈ ملا؟

(a) بھارت رتن (b) گیان پیٹھ

(c) بوکر پرائز (d) کوئی نہیں

(5) علی سردار جعفری کس کی ترجمانی کرتے ہیں؟

(a) ترقی پسند تحریک (b) حلقہ ارباب ذوق

(c) جدیدت (d) کوئی نہیں

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) علی سردار جعفری علی گڑھ یونیورسٹی سے کیوں نکالے گیے؟

(2) علی سردار جعفری نے کس صنف سخن سے شاعری کا آغاز کیا؟

(3) جعفری کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

(4) جعفری نے میٹرک کا امتحان کہاں سے پاس کیا؟

مختصر سوالات (Short type questions) :

(1) جعفریؔ کی شاعری کے موضوعات کیا ہیں؟

(2) جعفریؔ کے اہم شعری مجموعے کون کون سے ہیں؟

(3) ''ادب برائے زندگی'' سے کیا مراد ہے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) مشرق ومغرب میں کون سی باتیں ایک جیسی ہیں؟

(2) مغربی سرمایے کو میرے اور تیرے خون کی ارزانی کیوں کہا ہے؟

قصیدہ

قصیدہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ اس کا آغاز دور جاہلیت میں عرب میں ہوا۔ عربی شاعری سے فارسی شاعری میں پہنچا، فارسی کے ذریعہ یہ اردو میں آیا۔ عربی زبان میں لفظ قصیدہ کے معنی ہیں مغز غلیظ یا گاڑھا۔ چونکہ قصیدہ میں شاعر کو انتہائی ذہنی قوت صرف کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس صنف کو قصیدہ کہا گیا۔ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ قصیدہ لفظ قصد سے بنا ہے۔ جس کے معنی ارادہ، نیت، عزم کے ہیں۔ اس کا ظاہری مطلب یہ ہوا کہ شاعر ارادہ کر کے کسی کی مدح یا ہجو کرتا ہے۔ اس طرح سے قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح یعنی تعریف کی جائے یا، ہجو یعنی برائی کی جائے۔ اصطلاحی طور پر قصیدہ وہ مسلسل نظم ہے، جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخری مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قصیدے میں ایک سے زیادہ مطلع بھی ہوتے ہیں۔ قصیدے میں عام طور پر مدح، مذمت، نصیحت و موعظت یا مختلف حالات و کیفیت وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی:

تشبیب : اس میں تمہیدی اشعار کے ذریعہ قصیدہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں ہر طرح کے موضوعات کی گنجائش رہتی ہے مثلاً کیفیت شباب، واردات عشق، انقلاب زمانہ، مناظر فطرت،

پندونصائح وغیرہ۔

گریز: تمہید کے بعد گریز کو کچھ یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے بات میں بات نکل آئی۔ یہ سب سے نازک حصہ ہے۔ایک دواشعار میں بات کوایسے پیش کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کب وہ تمہید سے مدح/ہجو کی طرف چلا آیا۔

مدح یا ہجو: یہ قصیدہ کا اصل حصہ ہوتا ہے۔ مدح میں عام طور پر ممدوح کے علم وعقل، عدل وانصاف، دلیری وشجاعت اور عفت وسخاوت کی تعریف بڑے مبالغہ آمیز انداز میں کی جاتی ہے۔کبھی کبھی اس میں قصیدہ گو ہجو یعنی برائی کرتا ہے زمانہ کی، شہر کی یا کسی مخصوص فرد کی۔

دعا: یہ قصیدہ کا آخری حصہ ہے اس میں شاعر اپنے اغراض ومطالب یا ذاتی حالات کے بیان کے بعد ممدوح کی ترقی ولمبی عمر کے لیے دعا کرتا ہے۔کبھی کبھی دشمنوں کے لیے بددعا بھی کی جاتی ہے۔

اردوقصیدہ نگاری کی تاریخ میں سوداؔ کا نام سب سے اہم ہے۔سودا کے بعد ذوقؔ و غالبؔ نے قصیدہ کے فن کو عروج پر پہنچایا۔قصیدہ نگاری کے فن میں محسنؔ کاکوروی، منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی، نظم طباطبائیؔ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

سبق (24) مرزا محمد رفیع سوداؔ

مختصر سوانح

(1) نام : مرزا محمد رفیع

(2) تخلّص : سوداؔ

(3) ولادت : 1712ء دہلی

(4) وفات : 1781ء لکھنؤ

(5) قصائد : شہر آشوب، تضحیکِ روزگار۔

اصل نام مرزا محمد رفیع اور تخلص سوداؔ تھا۔ 1712ء میں دِلّی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم عربی، فارسی کی حاصل کی۔ شاعری میں شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ سوداؔ نے اپنی شاعری میں دلی کی تہذیب وتمدن، رہن سہن، بول چال کی نمائندگی کی ہے۔ جب دہلی پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا تو دوسرے صاحبانِ کمال کی طرح انھوں نے بھی وہاں سے ہجرت کی۔ دلی، فرخ آباد اور فیض آباد پہنچے، دارالحکومت کی تبدیلی کے ساتھ وہ لکھنؤ آ گئے۔ آصف الدولہ نے ان کی خاطر خواہ قدردانی فرمائی۔ 1781ء میں 70 برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

سوؔدا اپنے عہد کے عظیم شاعر تھے۔انھوں نے بیشتر مروجہ اصناف میں اپنے جوہر طبع کا مظاہرہ کیا۔لیکن جس صنف کی وجہ سے ان کی شہرت آسمان کی بلندیوں پر پہنچی وہ قصیدہ ہے۔سوؔدا قصیدہ کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔انھوں نے قصائد کو فارسی قصائد کا معیار عطا کیا۔ان کے قصیدوں میں پرشکوہ الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ان کے یہاں مدح سے زیادہ ہجو کا انداز ملتا ہے۔ان کے مدحیہ قصائد کی تعداد تشفی بخش ہے اوران قصیدوں میں انھوں نے اجزائے ترکیبی کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔سوؔدا نے ایسے قصائد بھی تحریر فرمائے ہیں جو ہجو اور طنز و مزاح کے عناصر سے پُر ہیں۔

نصاب میں شامل ''قصیدۂ شہر آشوب'' سودا کے مشہور قصیدے ''شہر آشوب'' کا مکمل حصہ تو نہیں ہے لیکن اسی سے ماخوذ ہے۔اس میں سوؔدا نے اپنے زمانے کی سیاسی اور معاشی بدحالیوں کی مکمل عکاسی کی ہے۔اس قصیدے میں انھوں نے مختلف پیشہ وروں، امرا اور رؤسا کی صورت حال کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔یہ قصیدہ اجڑی ہوئی دِلّی کا لفظی مرقع ہے۔

قصیدہ شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے مُنھ میں زباں ہے
میں حضرتِ سوؔدا کو سُنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ ہے! کیا نظم بیاں ہے
اتنا میں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت!
آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے
سن کر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا
اس امر میں قاصر تو فرشتے کی زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل
ہے وجہِ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے
گھوڑا لے ، اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ مکاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علَف و دانے کی خاطر
شمشیر جو گھر میں، تو سپر بنیے کے یاں ہے

سوداگری کیجیے ، تو ہے اس میں یہ مَشقَّت
دکھن میں بکے وہ ، جو خریدِ صَفَہاں ہے
شاعر جو سنے جاتے ہیں مُستَغنِیُ الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردُّد کو تو یاں ہے
مشتاقِ ملاقات انھوں کا کس و ناکس
ملنا انھیں اس سے جو فلاں ابنِ فُلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ
نیت قطعۂ تہنیتِ خانِ زَماں ہے
مُلائی اگر کیجیے ، تو ملاّ کی ہے یہ قدر
ہوں دو رُپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
اور ما حضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں
یک کاسۂ دالِ عَدَس و جو کی دو ناں ہے
دن کو تو وہ بے چارہ پڑھایا کرے لڑکے
شب خرچ لکھے گھر کا، اگر ہندسہ داں ہے
اب کیجیے انصاف، کہ جس کی ہو یہ اوقات
آرام جو چاہے وہ کرے، وقت کہاں ہے
چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت
چھٹتے شعرا ہی کے وہ مطعونِ زباں ہے

تحقیق ہوا عُرس، تو کر داڑھی کو کنگھی
لے خَیلِ مُریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے، تو واں سب کو ہوا وجد
کوئی کودے ہے، کوئی رووے ہے کوئی نعرہ زناں ہے
بے تال ہوئے شیخ جو ٹک وجد میں آ کر
سرگوشیوں میں پھر بد اصولی کا بیاں ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو، کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبٰی میں، یہ کہتا تھا کوئی، اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تَیَقُّن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی، گوئندے ہی کا محض گماں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے، تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست، نہ وہ یاں ہے نہ واں ہے

معنی اور اشارے:

پیر	=	بزرگ
قاصر	=	مجبور
معاش	=	روزی، رزق
علف ودانہ	=	گھاس اور اناج
سپر	=	ڈھال، پناہ
صفہاں	=	(اصفہان کا مخفف) ایران کا ایک شہر
قطعۂ تہنیت	=	وہ قطع جو خوشی کے موقع پر لکھا جائے۔
ماحضر اخوند	=	استاد کی روزی روٹی
کاسہ	=	پیالہ
عدس	=	مسور
ٹک	=	ذرا
مطعون	=	جس کو طعنہ دیا جائے
خیل	=	گروہ
عقبیٰ	=	عاقبت، آخرت
مستغنی الاحوال	=	اپنے حالات سے بے خبر

جمعیت خاطر = سکون قلب

آسودگی = سیرابی

تیقن = یقین

معیشت = زندگی

گوینده = کہنے والا

دغدغہ = خوف، اندیشہ

حرفیست = یہ ایک بات ہے

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) 'کاسہ' کے کیا معنی ہیں؟

(a) دل **(b)** سر

(c) پیالہ **(d)** زندگی

(2) سوداؔ کس شاعر کا تخلص ہے؟

(a) مرزا محمد رفیع **(b)** اسداللہ خاں

(c) خواجہ حیدر علی **(d)** شاہ نجم الدین

(3) اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے۔ وہ کس شاعر کا مصرع ہے؟

(a) میر دردؔ **(b)** مرزا رفیع سوداؔ

(c) میر تقی میرؔ　　　(d) ولی دکنیؔ

(4) سوداؔ کے قصیدے شہر آشوب میں کس شہر کی تباہی کا ذکر ہے؟

(a) دِلّی　　　(b) صورت

(c) احمد آباد　　　(d) حیدر آباد

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) قصیدہ شہر آشوب میں زمانے کی کیا مشکلات بتائی گئی ہیں؟

(2) ''دکھن میں بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

تفصیلی سوالات (Long type questions):

(1) مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح مع سیاق وسباق کریں:

اب سامنے میرے جو کوئی پیر وجواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سُنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ ہے! کیا نظم بیاں ہے

(2) سوداؔ کی قصیدہ نگاری کی خوبیاں بتائیے۔

مرثیہ

مرثیہ عربی زبان کے لفظ 'رثٰی' سے مشتق ہے۔جس کے معنی ہوتے ہیں موت پر رونا اور آہ وزاری کرنا۔اصطلاحِ شاعری میں مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کی موت پر اس کی خوبیاں بیان کرکے رنج وغم کا اظہار کیا جائے۔عرب میں یہ شور تھا کہ وہاں کے لوگ اپنے عزیزوں اور بزرگ شخصیات کی وفات پر رنج وغم اور درد والم سے پُر جذبات کو اپنے اشعار میں پیش کرتے تھے جنھیں مرثیہ کہا جاتا تھا۔لیکن بعد کے زمانے میں یہ واقعات کربلا سے مخصوص ہوگیا اور ایسی نظموں کو مرثیہ کہا جانے لگا جن میں حضرت امام حسین اور دیگر شہیدان کربلا کے اوصاف مناقب، ان کے آلام ومصائب اور ان پر ڈھائے گئے مظالم رقت انگیز انداز میں بیان کیے گئے ہوں۔

اردو میں یہ صنف عربی اور فارسی کے زیر اثر رواج میں آئی۔ یہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں کسی مرنے والے کے اوصاف وکمالات بیان کرکے اس کی موت پر آنسو بہائے گئے ہوں،لیکن ان کو شخصی مرثیہ کہا جاتا ہے۔

مرثیہ ایک قدیم صنف ہے۔ابتدا میں اس کے لیے کوئی شعری ہیئت مخصوص نہیں تھی۔شروع میں

یہ ''دوبیتی'' کی ہیئت میں ملتے ہیں۔لیکن زمانے کے ساتھ اس کی ہیئت میں بھی تبدیلی آتی رہی اورغزل مثنوی اورترکیب بند کی ہیئتوں میں بھی مراثی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ایک خیال ہے کہ مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت محمد رفیع سوؔدا نے سب سے پہلے استعمال کی اور اب اسی کو اپنا لیا ہے۔مرثیے میں ربط وتسلسل قائم رکھنے کے لئے اجزائے ترکیبی کا اہتمام کیا گیا ہے جو میر ضمیر کا مرہون منت ہے۔مرثیہ کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

(1) چہرہ: یہ مرثیہ کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے جس میں شاعر تمہید کے طور پر مختلف قسم کے مضامین جیسے بہار کا موسم،صبح کی خوبصورتی وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔

(۲) سراپا: مرثیہ کے جس حصے میں شاعر مرثیہ کے ہیرو کا بیان کرتا ہے اسے سراپا کہتے ہیں۔ اس میں ہیرو کے خاندان کی شان وشوکت،قد وقامت اور دیگر اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔

(۳) رخصت: مرثیہ کے اس حصے میں میدان جنگ میں جانے سے قبل ہیرو کا اپنے اہل وعیال سے ملاقات اور جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

(۴) آمد: ہیرو کا میدان جنگ میں آمد کا منظر اس حصے میں بیان کیا جاتا ہے۔

(۵) رجز: مرثیے کے اس حصے میں شاعر ہیرو کے آبا واجداد کے اوصاف وکمالات اوران

کی آن بان شان بیان کرتا ہے۔

(٦) **رزم یا جنگ:** اس حصے میں مرثیہ نگار، ہیرو کے ذریعہ میدان جنگ میں دشمنوں سے بہادری سے جنگ کرنے کا ذکر کرتا ہے۔

(٧) **شہادت:** یہاں شاعر مرثیہ کے ہیرو کا میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہونے کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ مرثیہ کا سب سے درد انگیز حصہ ہوتا ہے۔

(٨) **بین:** اس حصے میں شہید ہونے والے کے اہل وعیال اور عزیز واقارب گریہ زاری کرتے ہیں، اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ یہ مرثیہ کا آخری حصہ ہوتا ہے۔

سبق (25) میر انیسؔ

مختصر سوانح

(1) نام : میر ببر علی

(2) تخلّص : انیسؔ

(4) ولادت : 1802ء فیض آباد

(5) وفات : 1874ء لکھنؤ

(6) خصوصیاتِ کلام: بڑی تعداد میں الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال، عام فہم اور سادہ زبان میں فطرت نگاری اور جذبات نگاری

میر انیسؔ کا پورا نام میر ببر علی تھا۔ وہ انیسؔ تخلص کرتے تھے۔ 1802ء میں فیض آباد میں ایک معزز ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جہاں کئی پشتوں سے شعر گوئی اور سخن پروری کا رواج تھا۔ ان کے والد میر مستحسن خلیقؔ، دادا میر غلام حسنؔ اور پردادا میر غلام حسین ضاحکؔ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ان کے آبا و اجداد دلّی کے رہنے والے تھے۔ جب نادر شاہی حملوں کی وجہ سے دلّی تباہ ہوئی تو ان کے پردادا اپنے اہل و عیال کے ساتھ فیض آباد میں آ کر مقیم ہو گئے۔ میر انیسؔ کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ انھوں نے مولوی حیدر علی اور مفتی حیدر عباس سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں اپنے والد سے ضروری معلومات حاصل

کیں۔ انھوں نے صرف ونحو، عروض و منطق، تاریخ اسلام اور طب کا بھی مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ گھڑ سواری اور فنِ شمشیر زنی میں بھی مہارت حاصل کی۔

میر انیسؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ مگر والد کی تاکید کے بعد مرثیہ کہنے لگے اور اس صنف کو اپنی خداداد صلاحیت سے عروج کمال تک پہنچا دیا۔

لکھنؤ میں اس وقت مرثیہ کے فروغ کے لیے ماحول بہت سازگار تھا۔ اس لیے انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ **1857**ء کے غدر کے بعد وہ الہٰ آباد، بنارس، پٹنہ اور حیدرآباد بھی گئے۔ عمر کا آخری دور لکھنؤ میں گزارا اور **1874**ء میں یہیں انتقال فرمایا۔

انیسؔ اردو کے سب سے بڑے مرثیہ نگار ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہر دور میں ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ انھوں نے اپنے اعلیٰ ذوق، گہرے مشاہدے، زبان و بیان پر قدرت اور فنی بصیرت سے اردو شاعری کو شاہکار مرثیے عطا کیے ہیں۔ انیسؔ کے مراثی کا مطالعہ کرتے ہوئے جو چیز ہمیں متاثر کرتی ہے وہ ان کی واقعہ نگاری اور منظر نگاری ہے۔ میر انیسؔ جس واقعے کو بیان کرنا چاہتے ہیں، اس کی مکمل تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے ساتھ انھیں جذبات نگاری اور کردار نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں کربلا کے واقعات بیان کرتے وقت ان کے کرداروں کی اعلیٰ قدروں کو بڑی تعظیم اور آن بان سے پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہندوستانی تہذیب و تمدن کا بھی خیال رکھا ہے۔ انھیں زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل تھی جس کے باعث الفاظ کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ اِنھیں خوبیوں کی وجہ سے میر انیسؔ کے مرثیے اپنے عہد کی زندگی، مذاق اور شائستگی کے مکمل ترجمان بن گئے ہیں۔

مرثیہ

تھا یہ نعرہ کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں
مجھ کو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں
زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں
تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

ابر ڈھالوں کا اُٹھا تیغ دو پیکر چمکی
برق چھپتی ہے یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی
کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن اسے ڈستے دیکھا
مینھ سروں کا صفِ دشمن میں برستے دیکھا

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے

کوندنا برق کا شمشیر کی ضَو میں دیکھا
کبھی ایسا نہیں دم خم مہہِ نو میں دیکھا

کٹ گئی تیغ تلے جب صفِ دشمن آئی
یک بہ یک فصلِ فراقِ سر و گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی
تیغ کیا آئی کہ اُڑتی ہوئی ناگن آئی
غُل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں
زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

تنِ تنہا شہہ دیں لاکھ سواروں سے لڑے
بے سپر برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورتِ شیرِ خدا ظلم شِعاروں سے لڑے
دو سے اک لڑ نہیں سکتا یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جانِ علی ابنِ ابی طالب ہو

آئی ہاتف کی یہ آواز کہ اے عرش مقام
یہ وَغا تیسرے فاقے میں بشر کا نہیں کام
اے محمدؐ کے جگر بند امام ابن امام
لوحِ محفوظ پہ مرقوم ہے صابر ترا نام
اب نہیں حکم لعینوں سے وغا کرنے کا

ہاں یہی وقت ہے وعدے کے وفا کرنے کا

تھم گئے سن کے یہ آواز شہِ جن و بشر
روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانیِ شر
شمرِ ظالم ہے کدھر کھینچ کے لائے خنجر
ہے وہ عاشق جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

پہلے تیروں سے کماں داروں نے چھاتی چھانی
نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی
سر پہ تلواریں چلیں زخمی ہوئی پیشانی
خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخِ نورانی
جسم سب چور تھا پرزے تھے زرہ جامے کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عَمامے کے

دشت سے آتی تھی زہرا کی صدا ہائے حسینؑ
میرے بے کس مرے بے بس مرے دکھ پائے حسینؑ
در سے چلّاتی تھی زینب مرے ماں جائے حسینؑ
کون تیغوں سے بچا کر تجھے لے آئے حسینؑ
فاطمہ رو رہی ہیں ہاتھوں سے پہلو تھامے
حکم گر ہو تو بہن دوڑ کے بازو تھامے

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو بڑھا دشمنِ دیں
جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں
تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمرِ لعیں
آسماں ہل گئے تھرا گئی مقتل کی زمیں
کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پر رکھا
پاؤں قرآں پہ رکھا حلق پہ خنجر رکھا

ڈھانپ کر ہاتھوں سے مُنھ بنتِ علی چلّائی
ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی
ضربِ اوّل تھی کہ تکبیر کی آواز آئی
گر پڑی خاک پہ غش کھاکے علی کی جائی
اُٹھ کے دوڑی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
منھ کو کھولا تو سرِ شہ کو سِناں پر دیکھا

بس انیسؔ آگے نہ لکھ زینبِ ناشاد کے بین
قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں تھی لاشِ حسینؑ
قبر میں بھی نہ ملا احمدِ مختار کو چین
گھر جلا قید ہوئی آلِ رسولِ الثقلین
کتنے گھر شاہ کے مر جانے سے برباد ہوئے
لٹ گئے یوں کہ نہ سادات پھر آباد ہوئے

معنی اور اشارے:

خالق = پیدا کرنے والا مراد اللہ تعالیٰ

ہراساں = ڈرا ہوا

شناسا = پہچانا ہوا

تیغِ دو پیکر = دو دھاری تلوار

برق = بجلی

انبوہ = بھیڑ، مجمع

مینھ = بارش

شمشیر = تلوار

سپر = ڈھال جس پر تلوار کا وار روکتے ہیں

بشر = انسان، آدمی

مرقوم = لکھا ہوا

غُل = شور

مہِ نو = نیا چاند

خوشنود = راضی

مقتل	=	قتل گاہ
ناشاد	=	دکھی
سناں	=	برچھی
احمدِ مختار	=	رسول اللہؐ
بنت	=	بیٹی
اظلم	=	بہت زیادہ ظلم کرنے والا

کثیر الجواب پر مبنی سوالات (Multiple choice questions) :

(1) مرثیہ کس زبان کا لفظ ہے؟

(a) فارسی **(b)** عربی

(c) سنسکرت **(d)** اردو

(2) مرثیے کس ہیئت میں لکھے جاتے ہیں؟

(a) مربع **(b)** مخمس

(c) مسدس **(d)** مثلث

(3) مرثیے کے کتنے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں؟

(a) آٹھ **(b)** پانچ

(c) چھ **(d)** چار

(4) مرثیہ کا آخری حصہ کیا کہلاتا ہے؟

(a) چہرہ (b) شہادت

(c) بین (d) سراپا

(5) میر انیسؔ کا اصل نام کیا تھا؟

(a) مرزا سلامت علی (b) میر ببر علی

(c) میر مستحسن (d) میر غلام علی

(6) میر انیسؔ کہاں پیدا ہوئے؟

(a) الہ آباد میں (b) لکھنؤ میں

(c) فیض آباد میں (d) دلّی میں

(7) میر انیسؔ کے دادا کون تھے؟

(a) میر غلام حسنؔ (b) میر ضمیرؔ

(c) مرزا سوداؔ (d) میر خلیقؔ

(8) میر انیسؔ کا انتقال کب ہوا؟

(a) 1847ء میں (b) 1874ء میں

(c) 1828ء میں (d) 1774ء میں

(9) میر انیسؔ کے آبا و اجداد کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) حیدر آباد کے (b) کلکتہ کے

(c) ایران کے (d) دلّی کے

مختصر ترین سوالات (Very short type questions):

(1) مرثیہ کی تعریف بیان کیجیے؟

(2) شخصی مرثیہ کسے کہتے ہیں؟

(3) دو اہم مرثیہ گو شاعروں کے نام لکھیے؟

(4) آپ کے نصاب میں شامل مرثیے کا ہیرو کون ہے؟

(5) حضرت امام حسینؑ پیغمبرِ اسلام کے کون تھے؟

(6) ’’تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں‘‘

مندرجہ ذیل مصرع میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟

(7) صنعت تلمیح کی تعریف مثال کے ساتھ بیان کیجیے؟

(8) ’’صورت شیرِ خدا ظلم شعاروں سے لڑے‘‘

اس مصرعے میں شیرِ خدا کہہ کر کس اعلیٰ ہستی کا تذکرہ کیا گیا ہے؟

تفصیلی سوالات (Long type questions) :

(1) اردو مرثیہ نگاری پر تفصیلی نوٹ لکھیے؟

(2) میر انیسؔ کی حالات زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالیے؟

(3) میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے؟

(4) مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح ضروری حوالوں کے ساتھ کیجیے؟

(الف)

تھا یہ نعرہ کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں
مجھ کو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں
زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں
تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں
اس پر شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

(ب)

تھم گئے سن کے یہ آواز شہِ جن و بشر
روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانیِ شر
شمرِ اظلم ہے کدھر کھینچ کے لائے خنجر
ہے وہ عاشق جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

ضمیمه

قواعد (Grammar)

صنعت:

صنعت کے لفظی معنیٰ ’کاریگری‘ کے ہیں۔ زبان میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے کہ اس سے زبان میں خوبصورتی پیدا ہوجائے۔

مثلاً:

(1) وہ بچّہ پھول جیسا ہے۔

اس جملے میں ’پھول‘ کا استعمال بچّے کے نازک و معصوم ہونے کے لیے کیا گیا ہے۔

(2) نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں لفظ ’پنکھڑی گلاب سی‘ کا استعمال کر شاعر نے شعر کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیا ہے۔

صنائع وبدائع:

صنائع، صنعت کی جمع ہے جس کے معنی کاریگری کے ہیں بدائع بدیع کی جمع ہے۔ جس کے معنی ’’نادر اور نئی چیز‘‘ کے ہیں۔ کلام میں لفظی اور معنوی صنعت گری اور ندرت پیدا کرنے کو صنائع و بدائع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے استعمال سے شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ ان کے دو اقسام ہیں:

(۱) صنائع لفظی (۲) صنائع معنوی

(۱) **صنائع لفظی:** اس سے مراد وہ خوبیاں جو لفظوں کو خاص رعایتوں اور ہنرمندی

کے تھا بر تنے سے وجود میں آتی ہیں۔ ان کا تعلق کلام کے ظاہری پہلو سے ہوتا ہے۔

(۲) **صنائع معنوی:** ان کا تعلق کلام کے باطنی پہلو سے ہوتا ہے۔

حسن تعلیل: تعلیل کے معنی ہیں ''توجہ دلانا، وجہ بیان کرنا''۔ حسن تعلیل سے مراد کلام میں کسی ایسے وصف یا صفت کو ثابت کرنا جو حقیقت میں اس کی وجہ نہ ہو بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا گیا ہو۔

ے سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالبؔ

ے پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

انیسؔ

مراعات النظیر: کلام میں ایسے الفاظ کا جمع کیا جانا جن کے معنی میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی نسبت ہو مگر یہ نسبت تضاد و تقابل کی نہ ہو۔ مثلاً:

ے رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

غالبؔ

ے چہرہ مہروش ہے ایک سنبلِ مشک فام دو
حسنِ بُتاں کے دور میں ایک سحر ہے شام دو

سوداؔ

صنعت تضاد: کسی کلام میں دو ایسے الفاظ کا لانا جو معنوی طور سے ایک دوسرے کے ضد اور برعکس ہوں۔ مثلاً:

ؔ ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

میرؔ

ؔ نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالبؔ

صنعت تلمیح: کسی کلام میں تاریخی واقعات، شخصیات، یا قرآن و حدیث کی طرف اشارہ ہو اور اسے جانے بغیر شعر کا مطلب واضح نہ ہو، اسے تلمیح کہتے ہیں۔ مثلاً

ؔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبالؔ

ؔ کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

غالبؔ

ؔ قسم جو کھایئے تو طالعِ زلیخا کی
عزیزِ مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

میرؔ

صنعت لف ونشر: لف ونشر کے معنی لپیٹنے اور پھیلانے کے ہیں۔اس میں پہلے چند چیزیں ترتیب سے بیان کی جاتی ہیں۔اس کے بعد ان کے منسوبات اسی ترتیب یا دوسری ترتیب سے بیان کیے جاتے ہیں:

ے تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اقبالؔ

ے نہ ہمّت نہ دل ہے نہ قسمت نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا، نہ سمجھا، نہ پایا ، نہ دیکھا

ذوقؔ

صنعت تجنیس: جب کسی کلام میں دو ایسے الفاظ لائے جائیں جو صورت میں ایک جیسے ہوں لیکن معنی میں مختلف ہوں تو اسے تجنیس کہتے ہیں۔مثلاً:

ے دنیا میری بلا جانے مہنگی یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

فانیؔ

ے بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ حمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

غالبؔ

تشبیہ: تشبیہ کے معنی ''باہم مشابہ'' کے ہیں جب کسی ایک چیز کو دوسری چیز کے مثل بیان کرتے ہیں اور دونوں کی خصوصیات میں کوئی ایک مشترک خصوصیت پائی جاتی ہے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔مثلاً:

ے نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ

ے خدا نے اس کو دیا ایک خوب رو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ
غالبؔ

(1) مشبّہ: جس کو تشبیہ دی جائے۔ پہلے شعر میں ''لب'' کو تشبیہ دی گئی ہے۔
(2) مشبہ بہ: وہ چیز جس سے تشبیہ دی جائے۔ شعر میں لب کو ''گلاب'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔
(3) وجہ تشبیہ: وہ خصوصیت جو دونوں میں مشترک ہو اور وہ ہے 'لب اور پھول کی نزاکت'۔
(4) حرف تشبیہ: وہ لفظ یا حروف جن کے ذریعے مشابہت ظاہر ہو۔ وہ 'کی سی' ہے اور یہی حرف تشبیہ ہے۔

استعارہ: کسی کلام کے مجازی اور حقیقی معنی کے درمیان تشبیہ کا تعلق ہو جبکہ مشبہ اور حرف تشبیہ موجود نہ ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں:

ے تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اقبالؔ

ے کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
دبیرؔ

محاورے

لفظوں کا ایسا مجموعہ جو عام معنی نہ دے کر خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اسے محاورہ کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ حقیقی معنوں کی جگہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس پر جنس اور کلام کا اثر نہیں پڑتا۔ محاورات جملے کے حصے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں:

محاورے	معنی	جملوں میں استعمال
آب آب ہونا	شرمندہ ہونا	ارشد کی چوری پکڑے جانے پر وہ آب آب ہو گیا۔
آسمان سر پر اٹھانا	بہت زیادہ شور کرنا	کلاس ٹیچر کے جاتے ہی بچے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔
آگ بگولہ ہونا	غصہ ہونا	نسیم اپنے بھائی کی غلطی پر آگ بگولہ ہو گیا۔
آنکھ چرانا	کترانہ، نظر انداز کرنا	امتحان میں کم نمبر آنے کی وجہ سے اسلم اپنے والد سے آنکھیں چراتا پھرتا ہے۔

خاک چھاننا	دردر بھٹکنا	روزگار کی تلاش میں قاسم مختلف علاقوں کی خاک چھان رہا ہے۔
باغ باغ ہونا	بہت زیادہ خوش ہونا	احمد کی کامیابی پر اس کے والدین باغ باغ ہو گئے۔
اگر مگر کرنا	بہانے بنانا	مصیبت کے وقت مدد طلب کرنے پر اکثر لوگ اگر مگر کرنے لگتے ہیں۔
آنکھیں کھلنا	ہوش میں آنا	جب وسیم کی حرکتوں کا علم ہوا تو ان کے والدین کی آنکھیں کھل گئیں۔
اپنا الو سیدھا کرنا	اپنا کام نکالنا	مطلب پرست لوگ اپنا الو سیدھا کر کے چل دیتے ہیں۔
آسمان ٹوٹنا	سخت مصیبت میں آنا	اسلم کے والد کے انتقال کے بعد اس کے اوپر آسمان ٹوٹ پڑا۔
آپے سے باہر ہونا	سخت ناراض ہونا	شاگرد کی غلطی پر استاد آپے سے باہر ہو گئے۔
آنکھوں میں خاک ڈالنا	دھوکہ دینا	چور پولیس کی آنکھ میں خاک ڈال کر فرار ہو گیا۔
اینٹ سے اینٹ بجانا	تباہ و برباد کرنا	ہندوستانی فوج نے دشمنوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

بغلیں جھانکنا	نادم ہونا	احمد نے سبق یاد نہیں کیا تھا، جب استاد نے احمد سے پوچھا تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔
تارے گننا	بے قرار ہونا	رحیم کا کل نتیجہ آئے گا اسی وجہ سے وہ پوری رات تارے گنتا رہا۔
تن بدن میں آگ لگنا	شدید غصہ ہونا	وسیم کی بیہودہ باتوں سے ارشد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
چھکّے چھوٹ جانا	گھبرا جانا	پولیس کو دیکھتے ہی چور کے چھکّے چھوٹ گئے۔
سورج کو چراغ دکھانا	عقل مند کو عقل کی بات سکھانا	مولوی صاحب کو تقریر کا ڈھنگ سکھانا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔
آنکھ کا تارا ہونا	بہت پیارا	عبداللہ اپنے والد کی آنکھ کا تارا ہے۔
نو دو گیارہ ہونا	بھاگ جانا	پولیس کو دیکھتے ہی چور نو دو گیارہ ہو گئے۔
منہ میں پانی آنا	لالچ پیدا ہونا	جلیبی دیکھ کر وسیم کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔
کنواں کھودنا	نقصان پہنچانا	جو دوسروں کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود اسی کنویں میں گرتا ہے۔

ضرب الامثال

ضرب الامثال: عوام کے ذریعہ بیان کردہ وہ جملے جس کے پس پشت کوئی کہانی یا واقعہ پنہاں ہوتا ہے اوراس کا استعمال کسی خاص سیاق وسباق میں ہوتا ہے۔

ضرب الامثال	معنی	جملوں میں استعمال
آسمان سے گرا کھجور پر اٹکا	ایک مصیبت سے بچ کر دوسری مصیبت میں پھنس جانا	اسلم بغاوت کے کیس سے بری ہوتے ہی قتل کے مقدمے میں پھنس گیا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کی آسمان سے گرا کھجور پر اٹکا۔
ایک انار سو بیمار	ایک ہی چیز کے کئی امیدوار	ٹرین کی کھڑکی کے نزدیک سبھی لوگ بیٹھنا چاہتے ہیں یہ تو ایک انار سو بیمار والی بات ہوئی۔
ایک مچھلی تمام تالاب کو گندا کر دیتی ہے	ایک برا انسان تمام لوگوں کو خراب یا بدنام کر دیتا ہے	جمیل نے چوری کر کے پورے خاندان کو بدنام کر دیا یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ایک مچھلی تمام تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔

اونچی دوکان پھیکے پکوان	شہرت زیادہ اور اصلیت کم	ایک مشہور دوکان پر کپڑوں میں خرابی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں اونچی دوکان پھیکے پکوان ہیں۔
خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے	صحبت کا اثر ہونا	حامد نے جب سے امجد سے دوستی کی ہے اس کی شرارتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ رہا ہے۔
اندھے کو چاہیے دو آنکھیں	ضرورت مندوں کو اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے۔	وسیم کو ایک گھر کی خواہش تھی وہ اسے مل گیا ٹھیک ہی تو ہے اندھے کو چاہیے دو آنکھیں۔
دودھ کا دودھ پانی کا پانی	انصاف کرنا	چوری کے معاملے میں اجمل نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔
بھیگی بلی بننا	دب کر رہنا	حامد اپنے باس کے سامنے بھیگی بلّی بنا رہتا ہے۔
تین میں نہ تیرہ میں	کوئی دخل نہ ہونا	تم خاموش کیوں نہیں رہتے ہر معاملے میں دخل دیتے ہو جب کہ تم نہ تین میں ہو نہ تیرہ میں۔
چور کی داڑھی میں تنکا	خطا کار کی باتوں سے خطا ظاہر ہونا	شفا کو اپنے جرم کی صفائی دیتا دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا ہے۔

گھی کے چراغ جلانا	خوشی منانا	شاہد کے دوبئی سے واپس آنے پر ان کی امّی نے گھی کے چراغ جلائے۔
کھودا پہاڑ نکلی چوہیا	بہت زیادہ محنت کرنے کے باوجود کم فائدہ ہونا۔	پورے سال پڑھائی کرنے کے باوجود اسلم کو صرف ۴۰ فیصد ہی نمبر حاصل ہوئے۔ تو اس کے منھ سے یہی نکلا کھودا پہاڑ نکلی چوہیا۔
آم کے آم گٹھلیوں کے دام	دونوں طرف کامیابی	قاسم امتحان دینے آگرہ جا رہا ہے وہاں وہ تاج محل بھی دیکھنے جائے گا اسے کہتے ہیں آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔
سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے	درمیانی راستہ نکالنا	ٹھیکیدار اور زمیندار کے جھگڑے میں اس طرح کا فیصلہ ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مضمون

عیدالفطر

ہندوستان کے مخصوص تہواروں میں ہولی، دیوالی، دشہرہ، کرسمس اور عید ہیں۔ عیدالفطر مسلمانوں کا تہوار ہے مگر اسے سبھی ہندوستانی بڑے جوش وخروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ عیدالفطر کا انتظار سبھی کو بڑی بے صبری سے ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کے مقدس مہینے کے اختتام پر عیدالفطر کا تہوار دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ دن تمام لوگوں کی اجتماعی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ بوڑھا ہو یا جوان، امیر ہو یا غریب سبھی اس خوشی میں بڑے جوش وخروش سے شامل ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک کے **29** یا **30** روزہ مکمل ہونے پر جب چاند نظر آتا ہے تو اس کے اگلے دن عید الفطر ہوتی ہے۔ اس دن لوگ صبح سویرے اٹھتے ہی نئی نئی پوشاک پہن کر عیدگاہ جاتے ہیں اور عیدالفطر کی نماز ادا کر کے ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اس دن گھروں میں لذیذ کھانے پکوان بنتے ہیں سوئیاں اس دن کا مخصوص پکوان ہے۔

بچوں کے لئے تو یہ دن انتہائی خوشیوں والا ہوتا ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پہن کر بچے سیر وتفریح کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے محلوں اور گلیوں میں بہار آ گئی ہو۔ جگہ جگہ میلے لگے ہوتے ہیں جس میں طرح طرح کے کھلونے اور غبارے وغیرہ ملتے ہیں۔ گویا ہر طرف خوشی کا سماں نظر آ تا ہے۔ کھانے پینے کی دوکانیں بھی سجی رہتی ہیں جہاں بچوں کا ہجوم نظر آ تا ہے۔

عید کے دن سب کے چہروں پر خوشیاں نظر آتی ہیں کوئی اداس نہیں ہوتا۔ اگر کوئی تکلیف یا مصیبت میں نظر آئے تو ہمیں اس کی ہر طرح سے مدد کرنا چاہیے۔ یہ تہوار یہی پیغام دیتا ہے کہ اگر کوئی بے بس اور ضرورت مند ہو تو اسے بھی اپنی خوشی میں شامل کیا جائے۔

وقت کی اہمیت

انسانی زندگی کی تشکیل میں بلاشبہ وقت کی بڑی اہمیت ہے۔گزرا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا جولوگ وقت کو نظر انداز کرتے ہیں وقت ان کا ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔اسی لیے ہمیں چاہیے کہ وقت کی قدر کریں۔اس کے ہر لمحے کا صحیح استعمال کریں، کسی بھی کام کو وقت پر انجام دینے والا ہی کامیاب ہوتا ہے۔وقت بہت بڑی دولت ہے۔

غم اور خوشی کا ملنا بھی وقت پر ہی مبنی ہے۔وقت صرف اسی کا دوست ہے جس نے وقت کی قدر کی ہر لمحے کو قیمتی سمجھا۔کامیاب انسان کبھی بھی اپنا وقت فضول کاموں میں ضائع نہیں کرتا۔کیونکہ وقت کا غلط استعمال انسان کے لئے مہلک،اس کی ترقی میں رکاوٹ اور پشیمانی کا باعث بنتا ہے۔

اس دنیا پر غور وفکر کرنے پر احساس ہوتا ہے کہ پوری کائنات وقت کی پابند ہے۔سورج، چاند، ستارے، گرمی، سردی، برسات، بہار، خزاں وغیرہ وقت مقررہ پر ہی کام کرتے ہیں۔اگر یہ سب کچھ وقت کے مطابق نہ رہے تو تمام نظام قدرت درہم برہم ہو جائے گا۔بڑے بڑے مفکرین فلسفی، اور دانشوروں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام لوگ وقت کے پابند تھے۔ بڑے بڑے ادیب ،شاعر سیاستداں، سائنسداں وغیرہ نے اپنے زندگی کے ہر لمحے کا بخوبی استعمال کیا تب جاکر وہ عظیم کہلائے۔

وقت کا احترام کرنا حقیقی عبادت ہے جو لوگ حالات کے رو میں بہہ جانے کے عادی ہوتے ہیں اور وقت کی پابندی نہیں کرتے وہ اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ بہت مشہور مقولہ ہے کہ ''وقت انسان کا سب سے بڑا دوست ہے یا پھر دشمن'' جس نے وقت کی قدر کی اس کے لیے تو یہ دوست کی حیثیت رکھتا ہے، ہر طرح کے فائدے پہنچاتا ہے مگر جس نے وقت کی قدر نہ کی تو پھر اس کے لیے خسارے کا باعث بنتا ہے۔

طالب علم کو خصوصی طور پر وقت کا پابند ہونا چاہیے۔ صبح جلدی اٹھ کر اور وقت پر اسکول جانے اور مطالعہ کرنے سے صحت اور دماغ دونوں برقرار رہتے ہیں۔

کھیل

کھیل ہماری زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔ جوان، بوڑھے یا بچے ہر ایک کو کھیلنا پسند ہے۔ جسم اور دماغ کے لئے کھیل انتہائی مفید ہے۔ کھیل کود سے ہمارے اندر قوتِ توانائی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ کھیل کود بھی ایک قسم کی ورزش ہے جو ہمارے جسم کو چاک و چوبند رکھتا ہے۔ عام طور سے کھیل دو طرح کے ہوتے ہیں:

1. **بیرونی کھیل (Outdoor Game)**
2. **اندرونی کھیل (Indoor Game)**

بیرونی کھیل گھر کے باہر بڑی جگہ پر کھیلے جاتے ہیں۔ جیسے فٹ بال، کرکٹ، ہاکی وغیرہ جب کہ گھر کے اندر کھیلے جانے والے کھیل کو اندرونی کھیل کہتے ہیں۔ اس کے لیے بڑی جگہ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی مثلاً: لوڈو، کیرم بورڈ، شطرنج وغیرہ۔ ہماری ذہنی نشو ونما اور جسمانی قوت وتوانائی پر کھیلوں کا کافی اثر پڑتا ہے۔ بیرونی کھیل کھیلنے سے جسم کی ورزش ہو جاتی ہے۔ پورا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے اور کھلاڑی بالکل فٹ رہتا ہے، موٹاپا کبھی قریب نہیں آتا۔ اسی طرح میچ وغیرہ کھیلنے سے کھلاڑیوں میں کچھ مثبت

عادات پیدا ہو جاتی ہیں، جیسے ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ اپنے سے بڑوں کی عزت واحترام وغیرہ۔ یہی عادات آگے چل کر ان کھلاڑیوں کے ذریعہ ایک اچھا معاشرہ تشکیل دینے میں مواد فراہم کرتی ہیں۔

کھلاڑی جب کوئی بھی کھیل، کھیلتا ہے تو کچھ دیر کے لیے وہ تمام پریشانیوں کو بھول جاتا ہے۔ اسی طرح نئے نئے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جس سے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کھلاڑیوں کے اندر خود اعتمادی، نظم وضبط، ہمت اور اتحاد جیسی خصوصیات کھیلوں کے ذریعہ ہی آتی ہیں۔

آج کھیلوں کے ذریعہ لوگ عزت دولت اور شہرت بھی خوب کما رہے ہیں۔ اس طرح آج کے معاشرے میں کھیلوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

غیر درسی عبارت خلاصہ

غیر درسی عبارت سے مراد ایسی عبارت یا اقتباس جو ہمارے نصاب میں شامل نہ ہو لیکن امتحان میں اس کا خلاصہ اور اس سے متعلق سوالات پوچھے جائیں۔ طالب علم غیر درسی عبارت دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور اس کا خلاصہ یا مفہوم لکھنے کے بجائے اسے جوں کا توں کاپی پر لکھ دیتے ہیں۔ اُس کے لیے اگر چند باتوں کا خیال رکھا جائے تو خلاصہ لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(1) اقتباس کو غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ اقتباس میں کسی کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے اور کس بات پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔

(2) مشکل الفاظ کون کون سے ہیں اور کیا اقتباس میں کوئی محاورہ یا مثال موجود ہے...؟ اقتباس کے ذریعے مصنف کیا پیغام دینا چاہ رہا ہے۔ ان ضروری چیزوں کو ذہن میں رکھیں کیونکہ سوالات انھیں معلومات سے متعلق ہوتے ہیں۔

(3) خلاصہ لکھتے وقت خیال رہے کہ الفاظ جوں کا توں نہ لکھیں۔ بلکہ اس کا مفہوم سمجھا کر لکھیں۔ اقتباس کو پڑھ کر اسے آپ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ خیال رہے کہ خلاصہ تشریح کے زمرے میں نہیں آتا۔

(4) اقتباس سے متعلق جو بھی سوال پوچھے جائیں اس کے جواب عبارت کے مطابق ہوں۔ اس میں کوئی عبارت اپنی طرف سے نہ جوڑیں۔

(5) عنوان اقتباس کو پڑھ کر اسی میں سے نکالنے کی کوشش کریں۔عنوان موضوع کے مطابق ہو۔

نمونہ:

''اگر کامیابی کی منزل تک پہنچنا ہے تو وقت کی قدر کرنی ہوگی۔ ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں'' وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ یہ اپنی رو میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا مناسب استعمال کر اپنے حق میں بہتر بنائیں۔طلباء کے لیے ضروری ہے کہ اپنے وقت کو صحیح تقسیم کریں۔اپنے سونے جاگنے پڑھنے لکھنے اور ورزش کا وقت متعین کریں اور اس پر سختی سے عمل کریں۔تبھی کامیابی ممکن ہوگی۔کھیل کود، موبائل کے بے جا استعمال اور گھومنے ٹہلنے میں وقت برباد نہ کریں۔اگر وقت کو یوں ہی ضائع کیا تو یہ وقت آپ کو معاف نہیں کرے گا۔اور آپ کی بربادی کا سبب بنے گا۔''

(1) درج بالا اقتباس کا ایک مناسب عنوان لکھیے؟

(2) ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں'' کا جملوں میں استعمال کیجیے؟

(3) درج بالا اقتباس کا خلاصہ اپنی زبان میں کیجئے؟